کنواں آدمی اور سمندر

عوض سعید

سنہ اشاعت: ستمبر ۱۹۹۳ء
پہلا ایڈیشن: پانچ سو
سرورق: سعادت علی خاں
خوشنویسی: محمد عبدالماجد

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
ناشر: مصنّف
معاونت: اردو اکیڈمی آندھرا پردیش و ادبی ٹرسٹ حیدرآباد
قیمت: پچاس روپے Rs: 50/-

تقسیم کار:

- مکتبہ شعر و حکمت پنجہ گٹہ حیدرآباد
- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج نئی دہلی ۲
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی۔ بمبئی۔ علی گڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی۔
- ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکٹ علی گڑھ
- سیل کاونٹر۔ روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد
- الکتاب پبلشرز۔ گن فاؤنڈری۔ حیدرآباد۔
- اسٹوڈنٹس بک ڈپو۔ چارمینار حیدرآباد
- مصنّف 11-6-837/8 فرسٹ فلور۔ ریڈہلز۔ حیدرآباد-۴

سراج محمود کے نام.....

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں۔

فہرست

چند باتیں

افسانے کا سفر پرانی داستانوں سے شروع ہوا تھا۔ آج وہ اُس جگہ پر آپہنچا ہے جہاں اس میں اور شاعری میں فرق کم رہ گیا ہے۔

میرا خیال ہے افسانہ ابھی شاعری کے زینے تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ اس میں افسانے کی بڑائی یا مُسکی کی تلاش فضول ہے۔ لیکن افسانے کا یہ طویل اور لمبا سفر کب تک جاری رہے گا یہ کوئی نہیں بتا سکتا مجھے تو کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ میرا سفر بھی ایک انجانا سفر ہے۔ میں مدتوں سیدھے خطوط پر چلتا چلتا اب پچھلے چند برسوں سے غیر محسوس طور پر غیر متوازی خطوط پر چل پڑا ہوں۔

میں جب کبھی کسی تجربے کو گلے لگاتا ہوں تو وہ مجھے ڈستا ہے، کبھی کبھی وہ میرے وجود سے چمٹ کر میری اپنی شخصیت کا مُعجزہ بن جاتا ہے۔ افسانہ اور اس کے اجزاءِ ترکیبی ہمیشہ میرے لیے ایک معمّہ بنے رہے۔ ممکن ہے اس کا حل بعض نقادوں کے پاس ہو تو میرے پاس نہیں۔

وہ کردار جس نے سعادت حسن منٹو سے اچھی کہانیاں لکھوائیں اب ہم میں نہیں رہا۔ اور اب خود شناسی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی بازیافت کا مسئلہ بھی آکھڑا ہو تو لازماً میں کردار سے آنکھ ملا کر بات کرنے کا بھی اہل نہیں رہا۔ افسانے کے منظر نامے میں کہیں میرا نام ابھرتا بھی ہے یا نہیں مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ ویسے ہند و پاک کے کئی باشعور ادیبوں اور نقادوں نے میری بیشتر کہانیوں کو سراہا ضرور ہے۔ شاید اسی حوصلہ افزائی کے سبب اب تک میری کہانیوں کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔

"کنواں، آدمی اور سمندر" میرے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے، جو آپ کی نذر ہے۔ ممکن ہو تو اُسے پڑھیے اور اپنی گراں مایہ رائے مجھے لکھ بھیجئے۔

بھلاوا

پوسٹ مین کی مانوس آواز پر وہ اچانک اٹھ کر دروازے تک پہنچا اور ایک ثانیے کے لیے خط کی پیشانی پر لکھے ہوئے پتے پر نگاہ ڈالی۔ پتہ صحیح تھا مگر نام کچھ اور تھا۔ قبل اس کے کہ پوسٹ مین کو آواز دیتا وہ خط پھینک کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے جا چکا تھا۔

شام کو جب وہ باہر نکلا تو اُس نے اس خط کو احتیاط سے جیب میں رکھا اور چوراہے پر کھڑے ننگے پوسٹ بکس کے منھ میں اُسے بڑی بے دردی کے ساتھ پھینک دیا۔

اب وہ جانے کیوں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ اُس نے خواہ مخواہ جلد بازی سے کام لیا۔ ہو سکتا ہے پھینکا ہوا وہ خط اُسی کا ہو۔۔ پتہ تو اُسی کا تھا۔ نام میں بھلا کیا دھرا ہے۔ نہیں نہیں۔۔ نام ہی شناخت کا زینہ ہے۔ اگر وہ اسے بھی کھو دے تو باقی صرف اس کا چہرہ ہی رہ جاتا ہے۔ مگر شناخت تو چہرے ہی سے ہوتی ہے نام تو اس کے پیچھے ہاتھ باندھے چلتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا اور بے ارادہ تارکول کی لمبی سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔

ارے فہیم۔۔ یکبارگی ہجوم میں سے کسی نے آواز لگائی۔ آواز کے دوش پر اڑتا ہوا جب وہ اس کے قریب پہنچا تو وہاں دو اجنبی آپس میں گلے مل رہے تھے جیسے برسوں بعد وہ ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ یہ منظر اُسے بڑا پیارا لگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے خود آگے بڑھ کر اس اجنبی کو گلے لگایا ہو۔ وہ بھی تو فہیم ہی ہے مگر اُس کا چہرہ......

اب وہ کھویا کھویا سا راستہ طے کرنے لگا۔ وہ منظر جو تھوڑی دیر پہلے اُس نے دیکھا تھا اب وہ اپنی ذرا سی جھلک دکھا کر غائب ہو چکا تھا۔ اب اس کی جگہ دو آدمی آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ دونوں کے جسم سے خون کی سرخ سرخ بوندیں ٹپک رہی تھیں مگر لوگوں کے مشغل

میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اپنا بھائی مر رہا ہے ارے کوئی اُسے بچاؤ ۔" مگر وہاں بچانے والا کوئی نہ تھا۔

ایسے تماشے اس نے بہت دیکھے تھے، ایک طرح سے وہ خود ایک بہت بڑا تماش بین تھا۔ پھر لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ موت کے کنویں میں چھلانگ لگا رہے تھے اپنی چوّن سالہ زندگی میں اس نے اپنے کئی عزیزوں یاروں کو قبر کے منہ میں پھینک آنے کی اذیت دہ رسم ادا کی تھی۔ اس سے بڑا ظلم اس کے ساتھ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور تو اور مرنے والوں کی ایک لمبی فہرست اُس نے اپنے پاس رکھ چھوڑی تھی۔ جسے وہ ہر برس یوں دیکھتا جیسے وہ اپنی عمر کا حساب لگا رہا ہو۔ اکثر دفعہ تو اس نے چپکے سے اپنے نام کا اضافہ کر دیا تھا لیکن جب فہرست پر اس کی نگاہ جاتی تو ناموں کی جھرمٹ میں اس کا اپنا نام کہیں معدوم ہو کر رہ جاتا۔ تلاش بسیار کے باوجود جب اُسے فہرست میں اپنا نام دکھائی نہ دیتا تو وہ چپکے چپکے سسکیاں بھرنے لگتا۔ آخر وہ کب تک زندگی کی اس بے ہنگم سیڑھی سے چمٹا رہے گا۔ آخر کب تک؟ پھر ایک بار اُسے لگا جیسے سامنے کے ٹیڑھے میڑھے قبرستان میں لوگ کسی اور آدمی کی بجائے اُسے دفنا کر لوٹ رہے ہوں۔ اُن کے چہروں پر کہیں بھی اُداسی کی لکیریں نہیں تھیں۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا اُس کی موت کسی کے لیے بھی اُداسی کا سبب نہ بنے مگر یہ خواب اچانک ٹوٹ پھوٹ کر کانچ کے ذروں کی طرح سڑک پر بکھر کر رہ گیا۔

اب اس کے سامنے اُس کی اپنی بیوی کھڑی تھی۔

"کیا تم بھی ان ہی لوگوں میں سے تھیں۔"

"آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں۔"

"اُن ہی لوگوں کی جو ابھی ابھی......"

"چلئے یہ ناٹک بہت ہوا۔ گھر پر کچھ مہمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

بھری سڑک پر اس کی بیوی نے جب اس کا ہاتھ تھاما تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ گھر پر کچھ لوگ واقعی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے بھی کچھ عجیب سے تھے۔ جیسے وہ کسی انجانی دنیا کے باشندے ہوں۔

اُسے ڈرائینگ روم میں آتے دیکھ کر سب احتراماً اٹھ کھڑے ہو گئے اور فرداً فرداً مصافحہ کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اُسے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور کسی نے اپنی زبان کو جنبش نہ دی تو اسے حیرانی ہوئی۔ اور یہ حیرانی لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ لوگ ابھی تک احترام کا لبادہ اوڑھے اس کے سامنے کھڑے تھے جیسے اس کے حکم کے منتظر ہوں۔ پھر اس نے اپنی بیوی کو آتے دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ اس نے اشارے سے اسے اندر بلایا۔

"وہ آپ سے مسلسل باتیں کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ اُن کا کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ ان لوگوں نے ابھی تک کوئی بات ہی نہیں چھیڑی۔ تم مجھے پاگل بنا دو گی۔"

جب وہ بیوی سے دامن چھڑا کر ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو سارے لوگ چائے پی کر رخصت ہو چکے تھے۔ میز پر خالی دھری ہوئی پیالیاں جیسے اُس کا مُنھ تک رہی تھیں۔

یہ آنے والے بھی عجیب لوگ تھے جو آئے اور چلے بھی گئے۔ مگر وہ یہاں آئے کیوں تھے۔ کوئی سبب — کوئی وجہ — کوئی کام — کچھ بھی تو نہیں — وہ جھنجھلا سا گیا۔

"وہ کوئی عام لوگ معلوم نہیں ہوتے تھے۔" کسی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اور آگے بڑھ کر ٹی وی کے بٹن کو گھما دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ اُس کی بیوی کی آواز تھی جو سفید ساری میں ملبوس ایک سوالیہ علامت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اب اسکرین پر وہی گھسی پٹی سیریل چل رہی تھی جس سے بچنے کے لیے وہ دنوں سڑکیں ناپتا رہا تھا۔

جب اس کی بیوی نے کرسی سنبھالی تو وہ دبے پاؤں گھر سے نکل پڑا۔

سڑک انسانی قافلوں سے لدی ہوئی تھی۔ سیکلیں۔ کاریں، رکشائیں اور سکوٹروں سے بچتا بچاتا جب وہ سڑک کے کنارے آیا تو اس کی پیشانی پر پسینے کی دو ایک بوندیں چمک رہی تھیں۔

اب وہ کھویا کھویا سا مریل ٹٹو کی طرح سڑک پر چل رہا تھا۔ شام نے اپنے بادبان کھول رکھے تھے اور ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی جیسے چیخ رہی تھیں۔ پھر ایک بار اس کے دماغ کے پردے پر کچھ آڑھی ترچھی تصویریں ابھرتی چلی گئیں۔ ڈوبتے ابھرتے ان چہروں کو جھٹکنے کی اس نے بہت کوشش کی لیکن بے سود۔

آخر وہ کون لوگ تھے۔ کیوں اس سے ملنے آئے تھے۔ اگر انہوں نے چپ کی چادر اوڑھ بھی رکھی تھی تو کم از کم وہ خود ہی پہل کر کے پوچھ لیا ہوتا۔ کیا وہ ان ہی کاموں کے لیے رہ گیا ہے؟ یہ کام وہ خود بھی تو کر سکتے تھے۔ مگر ساجدہ نے یہ کیوں کہہ دیا کہ ان لوگوں نے اس سے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ آئے ہی نہ تھے اور خواہ مخواہ ــــ نہیں نہیں وہ آئے تھے اُس سے مصافحہ بھی کیا تھا اُور چائے بھی پی تھی۔ وہ پھر ایک بار گھبرا سا گیا اور چلتے چلتے ایک لمحہ کے لیے رُک گیا۔ اوپر آسمان کی چادر پھٹنے سے پہلے بادل کی طرح گرج رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے بہت بڑا طوفان آنے والا ہو۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کے بعد جب دفعتاً بارش نے زور پکڑا اور بجلیوں نے بے تحاشہ چمکنا شروع کر دیا تو وہ شیلٹر کی تلاش میں ایک سائبان کے نیچے جا کھڑا ہو گیا جہاں پہلے ہی سے کئی لوگ جمع تھے۔ وہ سامنے والے ہوٹل میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ لائٹ آف ہو گئی اور ایک مہیب سا اندھیرا اس کے اطراف منڈلانے لگا اُس نے سوچا۔ اب وہ اندر جا کر کیا کرے گا۔ مگر لائٹ نہ ہی ہوٹل کے منیجر نے موم بتیاں تو جلا رکھی ہوں گی۔

"اندر چلے آئیے صاحب۔ لائٹ آ ہی جائے گی۔" کسی نے اسے آتے دیکھ کر کہا۔

ہوٹل میں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میزوں پر دھری چھوٹی چھوٹی کچھ موم بتیاں اپنی آخری سانسیں لے رہی تھیں اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے لوگ اسے ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے کچھ عجیب پر اسرار فضا تھی۔

"روشنی اگر زندگی کی علامت بن سکتی ہے تو کیا تاریکی موت کا استعارہ نہیں بن سکتی۔"

"کیوں نہیں ـــ کیوں نہیں ـــ پھر اس کے بعد ایک لمبی سی چپ۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ اگر موسلا دھار مینہ برسا نہ ہوتا تو وہ یہاں کیوں چلا آتا۔ کوئی اور جگہ ڈھونڈ لیتا۔ ایک گوشۂ تنہائی پھر وہ اور صرف اس کی ذات اس کا وجود۔

مگر یہ لائٹ آخر کب آئے گی۔ بارش کب ختم ہو گی۔ کوئی بھی تو نہیں جو اُسے یہ جھوٹا دلاسا ہی دے سکے۔ مگر وہ اجنبی چہرے۔ وہ لوگ ــ

جب ٹیبل پر دھری بچا کھچا موم بتی نے آخری سانس لی تو کوئی اندھیرے کی چادر میں لپٹا چیخ اٹھا۔

"ارے بھائی یہاں کوئی آ رہے ہے"

پھر دفعتاً ایک زوردار گرج کے ساتھ بادلوں کے قافلے ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائے کہ لہراتی ہوئی بجلی شیشوں میں چھپے چہروں کو جیسے ٹٹولنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے جب اس کی نگاہ اُن عجیب و غریب چہروں سے ٹکرائی تو وہ یکبارگی بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔

"ارے یہ تو وہی لوگ ہیں جو اُس کے گھر ...."

اندھا کنواں

روز کی طرح آج بھی وہی اندھے مہیب سائے رینگ رہے تھے۔ گو اس نے گھر کے سارے کمروں کی روشنی جلا رکھی تھی، لیکن ہر بار اُسے یہی احساس ہوتا تھا کہ یہ مہیب سائے آناً فاناً میں اس کے اپنے وجود کو کسی خونخوار اژدہے کی طرح نگل جائیں گے۔ اور وہ چُپ چاپ ایک اندھے اور بے نام کنوئیں میں گر پڑے گا، لیکن اس کا اپنا یہ گھر بھی تو ایک اندھا کنواں ہی ہے، جہاں وہ روز ڈوبتا ور ابھرتا رہتا ہے۔ اُسے احساس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں اس کے گھر کی چوکھٹ پہ آکر اُسے آواز ے رہا ہو۔

اسے کون آواز دے گا۔ کوئی بھی تو نہیں، جو اُسے اس کے اپنے نام سے پکارے۔ نہ کوئی یار نہ غم گسار۔

اس کے اپنے ہی بچے جب ایک روشن مستقبل کا بہانہ بنا کر اُسے تنہا چھوڑ جائیں تو وہ کسی اور سے کیا گلہ کرے گا یہی ناکہ تم بھی میرے بچوں کی طرح خود غرض ہو۔

نہیں نہیں ــــ اس کے سارے دوست تو ایسے نہ تھے کہ وہ ان پر لعنت بھیجے۔ وہ اس سے ملنے آئیں تو وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا جائے، اور جب وہاں بھی آکر اسے دبوچ لیں تو وہ نڈھال سا ہو کر کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگے اور وہ ــــ

پھر اس نے دیکھا اس کے آنگن میں ایک کالا کلوٹا کوا مرا پڑا تھا، اور دیواروں سے چمٹے ہوئے ہزاروں بدصورت کوّے شور مچا رہے تھے ہو سکتا ہے وہ بین کر رہے ہوں، شکایت کر رہے ہوں۔ ایک طرح کا احتجاج بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس شکایت اور اس احتجاج سے اُس کا کیا تعلق۔ ۔ کچھ بھی تو نہیں ــــ مگر شور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

بڑا جان لیوا شور ـــ مگر یہ کیا ؟ وہ اسے چونچ میں دبائے کہاں اٹھا لے گئے ـ

اب اس کے آنگن میں موت کی سی خاموشی طاری ہے ـ ایک عجیب سا سکوت، جیسے چلتے اچانک رک گئی ہو، جیسے شہر کے سارے راستے مسدود ہو گئے ہوں ـ مگر اس وقت اس دروازے کی چوکھٹ سے چمٹا کون کھڑا ہے ـ

نہیں نہیں ـــ کوئی بھی نہیں ـ یہ اس کا واہمہ ہے، مگر وہ تو اسے دکھائی دے رہا ہے اس کے منجمد ہونٹ ہولے ہولے ہل بھی رہے ہیں ـ جیسے وہ ایک کرب اور آزمائش سے گزر ر مگر وہ چوکھٹ سے چمٹا کیوں کھڑا ہے ـ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے ان کالے کلوٹے بدصورت کو انتظار ہے ـ جو اسے اپنی نکیلی چونچ میں دبائے دور بہت دور ـــ

نہیں نہیں یہ تو ایک ـــ

کیا کسی نے آواز دی ـ

آواز ـــ ؟

آواز کی چھتیاں توکب کی طوفان کی زد سے گر چکیں، اب یہاں ایک کھنڈر ہے ـ صرف کھنڈر ـــ ایک قبرستان مگر کھنڈر میں بھی لوگ پانی کی تلاش میں آنکلتے ہیں ـ وہ لوگ کہاں میں انہیں ڈھونڈتا ڈھونڈتا تھک سا گیا ہوں ـ

جب میرے بچے خود میرے لیے عصائے پیری نہ بن سکے، تو یہ لوگ ـــ نہیں نہیں ـــ د بھی لوگ ہیں جیالے اس کے بیٹے ہیں ـ اس کے بچے ہیں ـ ورنہ اس ویرانے میں کون آتا ہے ـ کس کیا پڑی ہے کہ اس کے گھر آکر ایک نظر اسے بھی دیکھ ڈالے ـ مگر روشنیوں سے بھرے اس گھ رینگتا ہوا یہ مہیب سناٹا ـ یہ تاریکی !

مگر وہ کب تک اس طرح گھٹ گھٹ کر جیئے گا ـ آخر کب تک ـــ

وہ آدمی کچھ بولتا بھی تو نہیں ـــ اُسے بولنے سے کس نے منع کیا ہے ـــ کسی نے بھی تو نہیں تو پھر اُس نے یہ چپ چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے ـ وہ اس گونگی چادر کو تار تار بھی تو کر سکتا ہے ـ نہ وہ اس کے سامنے ننگا ہونا نہیں چاہتا ـ وہ اپنا لباس اپنی چادر کیوں تار تار کرے ـ کوئی وجہ کوئی سبب، کچھ بھی تو نہیں ـــ

ایسا سوچنا ہی غلط ہے۔پھر صحیح کیا چیز ہے، کوئی چیز صحیح نہیں ہے۔پھر بھی سب کچھ صحیح ہے۔
مگر درمیان میں کوئی تو چیز ہو گی۔کوئی راستہ۔کوئی منزل۔
منزل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور نہ راستے کی کوئی منزل۔
کیا کسی نے مجھے آواز دی۔
نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں ــــ
پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔
آواز ــــ ؟
کون سی آواز۔
آواز کا کوئی نام نہیں ہوتا۔
رشتہ تو ہوتا ہو گا۔
کہیں ایسا تو نہیں کہ چوکھٹ پہ کھڑے کھڑے ہی وہ چل بسا ہو۔
مگر وہ اس ویرانے میں آ کر کیوں مرنا پسند کرے گا۔کیا اس کے لیے اب ایسا کوئی سائبان نہیں جہاں جا کر وہ ــــ
مگر یہ آواز ــــ یہ شور ــــ کہیں اس کے آنگن میں پھر کوئی کالا کلوٹا بدصورت سا کوّا مرا پڑا نہ ہو۔
پھر یہ سائیں سائیں ــــ یہ جان لیوا شور ــــ یہ بکھرے ہوئے دانے ــــ یہ نُچے ہوئے پر۔
یہ سب کچھ کیا ہے ــــ کچھ بھی تو نہیں ــــ
محض ایک واہمہ ــــ ایک خواب
کیا کوئی جاگتے میں بھی خواب دیکھ سکتا ہے۔
ہاں ــــ دیکھ سکتا ہے ــــ ضرور دیکھ سکتا ہے۔
ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگے ہیں خواب میں۔
مگر یہ بات کہنے والا تو کبھی کا ــــ
مجھے کچھ بھی نہیں معلوم ــــ

پھر اسرار کا یہ پردہ کب ہٹے گا ۔
کون سا اسرار ـــ کون سا پردہ ؟
وہ جو ہمارے درمیان ہے ۔
مگر میرے گھر کے سارے زخمی پردوں کے درمیان صرف میں ہوں، یا میرا وجود، تم ادھر کہاں بھٹک کر آ گئے ...... سارے راستے تو بند ہیں ۔
راستے تمہارے لیے بند ہو سکتے ہیں میرے لیے نہیں ۔
ویسے بھٹکنا ہی شاید ہوش مندی کی علامت ہے ۔
شاید ـــ سے تمہاری کیا مراد ہے ۔
اپنی ذات کی بازیافت ـــ جو تمہاری بھی ہو سکتی ہے ۔
میری ـــ ؟
ہاں تمہاری ـــ ؟ تم نے تھوڑی دیر پہلے ہی کہا تھا نا کہ تمہارے گھر کے دروازوں کے سارے پردے تو زخمی ہو چکے ہیں ۔ گھر کے زخمی پردوں کے درمیان صرف تم ہو ۔ یا پھر تمہارا وجود ۔
ہاں کہا تو تھا ۔ مجھے اس سے کب انکار ہے ۔
انکار اقرار کے آگے ہاتھ جوڑتا ہے یا اقرار انکار کے آگے ؟
میں الفاظ کے ان گورکھ دھندوں میں پھنسنا نہیں چاہتا، تم یہاں آ کر مجھے خواہ مخواہ کچوکے لگا رہے ہو ۔ خدا کے لیے یہاں سے دفع ہو جاؤ ۔
کیوں گھبرا گئے ـــ وہ بھی اتنی جلد ـــ ؟
سچ کا کڑوا زہر جس نے پی لیا ہو ۔ وہ کسی سے کیا گھبرائے گا ۔
مگر میں دیکھ رہا ہوں تم مجھ سے گھبرا رہے ہو ۔
تم نے شاید یہ زہر صرف ایک بار پیا ہے ۔
میں سچ کے اس کڑوے زہر کو روزانہ چکھتا ہوں، بلکہ پیتا ہوں، کسی ٹھنڈے مشروب کی طرح بھی آہستہ ـــ کبھی تیز ـــ بہت تیز ۔

اس پر بھی تم زندہ ہو ــــ ؟

دیکھ نہیں رہے ہو۔ میں تمہارے سامنے ہی تو کھڑا ہوں مجھے ٹٹولو۔ مجھے تلاش کرو۔ کنویں میں جب ڈول نہ گراؤ گے تو پانی کس طرح پیو گے۔

میں تو پیاسا ہوں جس کے لیے کنواں خود روز چل کر آتا ہے، اور میری پیاس ــــ مگر لگتا ہے جیسے تم پھر بھی پیاسے ہو۔ جنم جنم کے پیاسے۔

کیا تم مجھے یہاں یہی جلی کٹی سنانے کے لیے آئے ہو ــــ

ہاں ہر نقاب کے پیچھے ایک حقیقت اور ہر حقیقت کے پیچھے ایک نقاب۔

تم کہنا کیا چاہتے ہو۔

کچھ بھی نہیں ــــ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ وہ میں نے کہہ دیا۔ اب میں خود ایک کاسہ بکف ہوں ..... بالکل تمہاری طرح!

مگر یہ کیا ــــ؟ پھر وہی شور ــــ وہی جان لیوا اور کریہہ آوازیں۔

کائیں ــــ کائیں ــــ کائیں ــــ کائیں۔

اُسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کے بدصورت اور کالے کلوٹے کوّے اس کے وجود کے سارے ٹکڑوں کو اپنی نوکیلی چونچ میں دبائے ایک نامعلوم سمت کی طرف پرواز کر رہے ہوں!!

تشنہ پیاسے

اور وہ جلدی جلدی اس واقعہ کو سنانے لگا جو ابھی ابھی اس پر بیت چکا تھا۔ اس کی باتیں کچھ بے ربط سی تھیں واقعات پیش کرنے میں شاید وہ مبالغہ سے کام لے رہا تھا لیکن اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دور سے پیدل چل کر یہاں آیا ہے۔

" ذرا ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھول دو، مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی ہے ممکن ہو تو ایک گلاس پانی ہی پلا دو۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے پاؤں آرام کرسی پر اس طرح جما دیئے جیسے وہ چند لمحوں کے لیے سکون چاہتا ہو۔ میں نے اس کے سامنے پانی کا گلاس لا کر رکھا مگر وہ پانی پینے کے بجائے سگریٹ پینے لگا پانی یوں ہی دھرا رہا۔

میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود بات آگے بڑھائے اب تک اس نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا تھا وہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ "اب میں اُس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔" درمیان میں بڑے کرب کے ساتھ اس نے یہ جملہ کہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ "میں نے تم سے پانی منگوایا تھا شراب کا جام نہیں جس کے لیے تمہیں بھولنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

میں بجائے جواب دینے کے سامنے دھرا ہوا گلاس اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ وہ غٹا غٹ پانی پی گیا۔

" ہاں میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تم رائٹر ہو"

کیا تم بتا سکتے ہو زمین کے عذاب سے تنگ آکر ان مُردوں نے کس انداز

سے مجھے دیکھا تھا مگر قبر کے وہ دروازے اچانک کیوں مقفل ہو گئے۔

تم کھو گئے دائمی تنہائیوں کا کرب وہ اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے اٹھا لے گئے کہیں ایسا تو نہیں میں یہاں اپنی حماقت کا کفارہ ادا کرنے چلا آ گیا۔

مجھے وہ پہلی سیڑھی یاد ہے جس پر چڑھ کر میں نے سوچا تھا کہ منزل پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پہلی منزل سے آگے ایک دوسری منزل بھی ہے جہاں پہنچنے سے پہلے مجھے ایک بار ٹھوکر کھانی ہے لیکن میں ابھی تک پہلی سیڑھی ہی پر کھڑا ہوں۔ دوسری منزل کے زینے پر ٹھہرے ہوئے اس آدمی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں جو ہمیشہ چہرے پر نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ وہ زینے سے اس طرح چمٹ گیا ہے جیسے وہ آدمی نہیں جونک ہو۔ مگر پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ لوگ سڑک پر چلتے ہیں۔ پتہ نہیں ان لوگوں کو سڑک پر اس طرح چلنے کی عادت کیوں پڑ گئی ہے۔ کیا مسلسل چلتے رہنا بھی ایک ہوس ہے۔ یہ لوگ کس کے تعاقب میں ہراساں ہیں مگر وہ دوسری منزل سے چمٹا ہوا آدمی۔

کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں وہاں کیسے پہنچ سکا۔ جب کہ دوسرا زینہ۔

ایک بار پھر وہ چپ ہو کر رہ گیا۔

شام دھواں دھواں سی لگ رہی تھی۔ ہوا کے دبیز جھونکے کھڑکیوں کو پھلانگتے ہوئے دبے پاؤں اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس واقعہ کا سب سے اہم کردار میں ہی ہوں۔ اس کی بے ربط باتوں کو سن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر چیز سر تا پا جھوٹ ہے۔ برہنہ ہے۔ ہر مسکراہٹ کے پیچھے ناکام آرزوؤں کا ایک ہجوم ہے جس میں شاید وہ گھرا ہوا ہو۔

تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ میں جانتا ہوں۔ تمہاری خاموشی اس پرندے کی مانند ہے جو صدیوں سے ایک ہی درخت پر بیٹھا ہو۔ راشٹر یہ کہہ کر وہ بجائے مسکرانے کے بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کی یہ ہنسی مجھے بڑی بھیانک لگی۔ ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی ویران قبرستان میں کوئی الّو بول رہا ہو۔

دوسری منزل کا وہ کشادہ زینہ اور اس سے چمٹا ہوا وہ آدمی۔

رات روشنی اندھیرا۔۔۔ اندھیرا روشنی اور پھر رات اور رات کی کوکھ سے جنم لینے والے نقلی چہرے۔ کہر کی طرح غائب ہوتے ہوتے یہ مصنوعی لوگ۔۔۔ دیکھو چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔

اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ اس کے چہرے پر اداسیاں نوحہ گر تھیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک ایسی نعش ہے جسے قبر نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔

" مگر یہ تمہارا واہمہ ہے۔ وہ تو رات کے قدموں کی چاپ ہے جو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر رہی ہے۔ صبح کے شبنمی نظارے کا لطف شاید تم نے کبھی نہیں اٹھایا۔

" رات کنکر بن کر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ میرے لیے رات اور دن ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ میں ان مبہم سرگوشیوں کی سرسراہٹ سے واقف ہوں۔ جو میرے سینے کو روندتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح دور نکل جاتی ہے۔ مگر میں تو ابھی تک پہلی منزل کی پہلی سیڑھی ہی پر کھڑا ہوں۔" کیا تم مجھے ایک اور گلاس پانی پلاؤ گے۔ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

کیوں نہیں ضرور کہہ کر میں نے اس کے سامنے پانی سے بھرا دوسرا گلاس رکھ دیا۔ تم بھی میری طرح بڑے تابعدار ہو۔ اور ایک اچھے میزبان بن سکتے ہو لیکن جب مہمان ذلیل ہو تو میزبان کی شرافت اس دسترخوان کی طرح ہو جاتی ہے جسے کہیں بھی جھٹک دیا جاتا ہے۔ آج میری حالت بھی اسی دسترخوان کی سی ہے۔ یہ کہہ کر وہ روہانسا ہو گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں کے کونے میں آنسوؤں کی موہوم لکیریں علانیہ دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی موجودہ زندگی سے کافی اکتا گیا ہو۔

دو جو آدمی پہلی سیڑھی کو اپنی منزل سمجھے اس کے لیے دوسری منزل کا زینہ زخم بھی بن سکتا ہے، اور مداوا بھی ۔"

اس نے میرے ذہن میں چھپے ہوئے اس جملہ کو یوں دہرایا جیسے یہ جملہ میں نے نہیں اس نے کہا ہو۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے کیوں طنزیہ انداز میں مجھے رائٹر کہا تھا۔

پھر قدرے توقف کے بعد اس نے کہا ۔ "بوجھ اٹھانے سے گردن جھک جاتی ہے اور گردن کا جھک جانا ندامت کی علامت ہے ۔ مگر میں نے یہ زہر بھی پی لیا ہے ۔ میرے رگ و پئے میں شاید یہی زہر سرایت کر چکا ہے ۔

پہلی منزل کی سیڑھی پر قدم رکھ کر دوسرے زینے کی تلاش میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے ۔ مگر تم تو ایک رائٹر ہو ۔ وہ تحقیر آمیز انداز میں مسکرایا۔

میں نے درمیان میں اُسے ٹوکتے ہوئے کہا ۔ "آج کے بعد شاید تم اس سے پھر نہ ملو گے ۔"

شاید ایسا ہی ہو۔ کیوں کہ آنے والے کل کے سورج کو کس نے دیکھا ہے ۔ رات میں طلوع ہونیوالے اس زرد و سفید چاند کو بھی کوئی روز دیکھ سکتا ہے مگر میرا المیہ دوسری منزل کا پہلا زینہ ہے ۔

جس سے وہ آدمی جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے ۔ میں پہلی منزل پھلانگ کر کبھی ۔ دوسری منزل کے اس زینے تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں یہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا ۔" "بوجھ اٹھانے سے گردن جھک جاتی ہے نا ۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے وہ قدرے خجالت سی محسوس کر رہا تھا ۔ پھر وہ یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم ڈالتا ہوا ڈرائینگ روم سے باہر سڑک کے ہجوم میں کھو گیا ۔

اُداس نسل کا آخری آدمی

وہ لوہے کے بنے اس بڑے پھیلے ہوئے پُل پر کھڑا تھا۔ جس کے نیچے وسیع تالاب تھا اور تالاب کا ساکت پانی چاندی کے ورق کی طرح صاف اور اُجلا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے تنہا کھڑا تھا۔ لیکن اب لوگ باگ جمع ہو گئے تھے۔ دراصل وہ لوگوں ہی کا انتظار کر رہا تھا کہ خودکشی کرتے ہوئے سب لوگ اُسے دیکھ سکیں۔ وہ تنہا اگر پانی میں چھلانگ لگا دے اور یوں ہی مر جائے تو یہ گمنامی کی موت ہو گی۔ وہ سب کے سامنے پانی کی آغوش میں غوطے کھاتا رہے گا تو بظاہر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ چھلانگ لگا کر اُسے بچا لے گا۔ اور وہ اس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر آج جو اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے وہ اس طرح سلیقے سے پورا ہونا چاہیے کہ وہ بیک وقت موت اور زیست کا مزہ چکھ سکے۔

زیست کا مزہ چکھتے ہوئے اسے تیس برس ہو چکے تھے۔ اب منہ کا مزہ بدلنے کے لیے خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے وہ ساری باتیں بغور سن رہا تھا۔

"پہلے ہی سے کونسے خوشحال تھے۔ اب اس گرانی نے تو کہیں کا نہ رکھا۔ سکوٹر گھر میں رکھ دی ہے۔ پٹرول پہ اگر ہر ماہ ڈیڑھ سو روپے اٹھ جائیں تو اس سے بہتر ہے آدمی پیدل چلے۔"

"مگر پیدل گھو[illegible] سے آدمی باغی ہو جاتا ہے۔ تم تو صدا ہی سے صلح پسند آدمی ہو۔"

"یار تو پل پر کھڑا ہو کر بھی ایسی باتیں کرتا ہے۔"

"انہیں پٹرول کی پڑی ہے اور ہمیں کھانے کی۔ بازار میں کھانے کی کوئی چیز ہی نہیں ملتی۔
"سب جھوٹ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری ہوٹلیں بند نہ ہو جاتیں۔"
"یار تو سدا کا جھکّی ہے۔ اب تیرے سامنے کون اپنا دماغ خراب کرے۔"
"دماغ ہو تو خراب ہوگا۔"
"تیرا مطلب ہے کہ میں بے دماغ ہوں۔"
"یار تو مذاق بھی نہیں سمجھتا۔"
"مذاق سمجھا نہیں جاتا محسوس کیا جاتا ہے۔ اُس نوجوان کو دیکھ پل پر چپ چاپ کس طرح کھڑا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے خلیل جبران نے پھر ایک بار جنم لیا ہو۔"

وہ چپ چاپ گہری سوچ کا لبادہ اوڑھے بُت کی طرح کھڑا تھا۔

"خلیل جبران یہ تو بہت بڑے اور بہت پرانے آدمی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ کم بخت نے نام لیا بھی تو اس آدمی کا جس کا صفحۂ ہستی پر اب کوئی وجود نہیں۔ مگر وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی مر کر بھی امر ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی قبیل کا آدمی ہو۔ مگر اُسے نہ مرنا ہے اور نہ جینا
وہ اپنے اس عجیب و غریب مضحکہ خیز خیال پر آپ ہی آپ مسکرایا۔
"سالا اب کہیں جا کر مسکرایا ہے۔" اس کو منٹ پر اس کے ہونٹوں پہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ قدرے سکڑ کر رہ گئی۔

"تو نے تو اسے پوری طرح مسکرانے بھی نہیں دیا۔"
"تیرا مطلب ہے اس نے میری بات سن لی۔"
"اور نہیں تو کیا۔"
"ادھر دیکھ۔ پھر وہ مسکرا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس نے میری بات نہیں سُنی۔"
"یار تو تو ہر بات میں دلیل چاہتا ہے۔"
"مگر یہ کیا پھر وہ سنجیدہ ہو گیا ہے۔ کیا لبوں پر مسکراہٹ چند لمحوں کے لیے آتی ہے۔"
"ہم یہاں تفریح کے لیے آئے تھے تو نے بور کرنا شروع کر دیا۔ اس سے بہتر ہے اپنی رہائش کے ہاں چلیں۔"

" وہاں تو ہمیشہ "کیو" لگا رہتا ہے۔"

" ارے کیو توڑنا کونسی مشکل بات ہے۔ بازوؤں میں قوت ہو اور پیسہ ہو تو کیو کی کیا حقیقت ہے۔ دو چار چلتے ہوئے گانے تو سن سکتے ہیں۔"

اب ان لوگوں کی توجہ دوسری طرف منعطف ہو چکی تھی۔ اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ کے مرغولے فضا میں لہرانے لگا۔

" دیکھ یہ دھوئیں کے مرغولے کس قدر خوبصورت بنا رہا ہے۔ بڑی انفرادیت ہے سالے میں۔ مگر اس کا یہ اکیلا پن۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہماری اُداس نسل کا آخری آدمی ہے۔"

اب رومانی وقتی طور پر پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اور وہ موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔

" یار اُس سے چل کر ملیں۔"

" تو جانیں بغیر تعارف کے کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔"

" یار ہم تو کھلے اشتہار ہیں وہ خود ہی پوسٹر پڑھ لے گا۔"

قبل اس کے وہ کسی نتیجے پر پہنچتے پُل پر کھڑے ہوئے آدمی نے تیزی سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ تالاب کے ساکت پانی میں جیسے کسی نے بہت بڑا پتھر پھینک دیا ہو۔

اب وہ غوطے کھا رہا تھا۔

" ارے اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔" وہ متحیر انداز میں چیخ پڑے۔

" اسے بچاؤ بھائی لوگ" اور بھائی لوگ اُسے ڈوبتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک لمحہ کے لیے پانی کی سطح پر نمودار ہوتا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو جاتا۔ سب لوگ یہی چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح بچ جائے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پانی میں سے اُسے نکالے۔ لوگ خوف کے مارے اپنی اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ سب چیخ رہے تھے۔ پکار رہے تھے۔ لیکن کوئی پانی میں چھلانگ لگانے کو تیار نہ تھا۔ وہ پانی کی سطح پر ڈول رہا تھا۔ لوگوں کی زبانوں سے نکلتے ہوئے جملے قطرہ قطرہ زہر کی مانند اس کے کانوں سے دل میں اتر رہے تھے۔ پندرہ بیس آدمیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اُس

کے لیے چھلانگ لگا سکے ۔ اب اس کے لیے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لوگوں نے پھر ایک بار سطح پر نمودار ہوتے ہوئے اُسے دیکھا ۔

" یار بڑا ڈھیٹ ہے ۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک مر گیا ہوتا ۔ "

" مرنا بہت آسان ہے یار جینا بہت مشکل ہے ۔ بھلا وہ اتنا احمق تھوڑا ہی ہوگا جو موت سے دامن چھڑا کر زندگی کے آنچل میں منہ چھپا لے ۔

" یار کیوں ہندوستانی فلموں کے ڈائیلاگ دہرا رہا ہے ۔ اُسے دیکھ وہ تو غوطے کھاتے کھاتے چت ہو گیا ہے ۔ جیسے مر نہیں رہا ہو بلکہ کسی ماہر پیراک کی طرح تیر رہا ہو ۔ "

اب وہ سچ مچ جیسے تیر رہا تھا ۔ اس کے دونوں ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور پانی کے اندر اس کے پاؤں حرکت کر رہے تھے ۔

وہ لمحہ لمحہ آگے بڑھ رہا تھا ۔ لوگوں کے چہروں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بچ نکلنے پر وہ خوش نہیں ۔

جب اچانک کنارے پر پہنچ کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تو سب لوگ منہ لٹکائے ایک دوسرے کو یوں تک رہے تھے جیسے وہ اپنے آپ شرمندہ ہوں ۔

پھانس

ایک طویل مدت کے بعد جب اچانک اُس سے میری مڈبھیڑ ہوگئی تو وہ مجھے کافی نڈھال اور مردم گزیدہ سا لگا۔ اس کے موٹے موٹے خشک ہونٹوں کی محراب سے اس کے میلے دانت یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ دانت نہ ہوں سیتاپھل کے بیج ہوں۔

میں نے اس کی ذات میں دلچسپی لینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ حتمی طور پہ میری مدد کا محتاج ہو۔ تاہم وہ ساری پچھلی باتیں اور یادیں لگ بھگ بھلا چکا تھا۔ بھولنا اور بھلا دینا شاید اس کی کمزوری تھی۔

آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی دیکھی۔ ایک ایسی ویرانی جو الفاظ کے کئی حصاروں کو توڑ سکتی ہے لیکن گرفت میں نہیں آتی۔ میں جلدی میں تھا شاید میں جلدی میں نہیں تھا۔

پھر وہ کونسا جذبہ تھا جس نے مجھے نہ آگے بڑھنے کی اجازت دی اور نہ پیچھے ہٹنے کی۔
کیا یہ ممکن ہے کہ آیندہ پھر کبھی ہم فرصت سے ملاقات کر سکیں۔"

"نہیں ـــــ نہیں، جو بات بھی ہوگی آج ہی ہوگی۔ اس کے بعد پھر کبھی نہ ہوگی۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں۔ کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے یاروں ہی کے سامنے اس کا ذکر کر سکتا ہے۔

"تم عمارت کی بنیادیں غلط پتھر رکھ رہے ہو۔ تمہیں یقین ہے کہ میں تمہارے مسائل میں دلچسپی دکھاؤں گا۔"

"یقین ہے اور ساتھ ساتھ اعتماد ـــــ اور بھرپور اعتماد۔"

یقین اور اعتماد میری نظر میں بڑے بودے لفظ ہیں ۔"

ٹریفک کے شور میں میری باتیں شاید وہ سن نہیں پا رہا تھا اور اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

"اچھا ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ کوئی گوشۂ تنہائی تلاش کریں اور وہاں بیٹھ کر ....

"دراصل ان بھاگتے دوڑتے چہروں کو دیکھتے دیکھتے میں اُوب سا گیا ہوں ۔ وہی سڑکیں۔ وہی ہوٹلیں، وہی لوگ لیکن مدتوں بعد تمہارے چہرے کی زیارت نصیب ہوی ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر دید کا بار اٹھا لوں ۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُداسی کا ایک نوحہ بن گیا ۔میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ ہو لیا ۔

وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کا گھر اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و بالا تھا ۔یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اسی کا گھر ہے ۔ سرونٹس کوارٹرس سے گزرتے ہوئے سلام کرنے اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر میں ویسے بھی دم بخود تھا ۔لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کی لہریں ہویدا تھیں ۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے ۔

"کیا بھابی گھر میں نہیں ہے ــــ ؟"

"کس کی بھابی تمہاری یا میری ــــ ؟"

اس کے جواب کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مزید میں اس سے کوی اور سوال کر سکتا۔

"چائے پیوگے ــــ یا ڈرنکس لوگے ــــ ؟"

"چائے ہی ٹھیک رہے گی ۔"

"میں اپنی مرضی کبھی کسی پر نہیں ٹھونستا ۔تم نے چائے کے علاوہ زہر کی بھی فرمائش کی ہوتی تو میں خوشی خوشی زہر کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں تھما دیتا اور تمہیں مرتا ہوا دیکھ کر اطمینان محسوس کرتا کہ کہیں تو میرا وجود کسی کے کام آیا۔ دراصل میں یہاں تمہیں اس لیے لایا تھا کہ اپنے بارے میں تم سے کچھ کہہ سکوں ۔کئی دنوں سے میرے ذہن پر ایک بوجھ ہے ۔ میرا ذہن وسوسوں، اندیشوں اور خوف کے بے نام سایوں سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کبھی کبھی خود میرا وجود کانپ جاتا ہے۔ میں ان دنوں بڑے پیچیدہ مسائل سے گزر رہا ہوں ۔"

وہ اپنے ہر تیسرے جملے کے بعد اسی بات کو دہراتا رہا کہ مسائل بے حد پیچیدہ ہیں ۔ اور

نجات کا کوئی راستہ نہیں ۔ چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں ۔۔۔ وہ یہ کہتے کہتے روہانسا ہو گیا ۔ اور ہانپنے لگا ۔

وقت رینگ رہا تھا لیکن رازوں میں ڈھکے کہانی کے انجام سے میں ہنوز نا واقف تھا ۔ میں کوشش کے باوجود اس کی دلجوئی نہ کر سکا ۔ اب میرے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا لیکن میرے مسائل اس سے مختلف تھے ۔ وہ سخت ذہنی الجھنوں اور اعصابی کیفیت سے دوچار تھا ۔ اور سزا میں بھگت رہا تھا ۔ گھڑی کا ہر سکنڈ ہر منٹ مجھے پہاڑ کی طرح لگ رہا تھا ۔

" میرا انجام دیکھ رہے ہو ۔ ؟ " اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ۔

" کیا تم مجھے اپنے ہاتھ کی ریکھائیں بتانا چاہتے ہو ۔ "

" مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ خود میرے ہاتھ میں دھن ریکھا بھی ہے ۔ اور رنگِ آف سولومن بھی

" تم تو آخر چاہتے کیا ہو ۔۔ "

" میری گھڑی کی طرف دیکھو ۔۔۔ " اس کا سانس پھول رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے باریک باریک قطرے نمایاں انداز میں دکھائی دے رہے تھے ۔ اس نے اپنے ہونٹوں میں دانت اس طرح گاڑ رکھے تھے جیسے کوئی خوف کے تصور سے ہراساں ہو ۔

تمہاری گھڑی تو برابر چل رہی ہے ۔ "

نہیں ۔۔۔ سکنڈ کا کانٹا گھوم نہیں رہا ہے ۔ غور سے دیکھو ۔۔۔ ؟ "

لیکن میں بجائے گھڑی کے اس کے چہرے کو حیرانی سے دیکھتا رہا ۔

اُس نے کہا ۔۔ میری موجودہ زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو کر رہ گئی ہے ۔۔ "

لیکن گھڑی سے اِن باتوں کا کیا تعلق ۔۔۔ ؟ "

" میرے سارے پیچیدہ مسائل اسی گھڑی کے گرد گھوم رہے ہیں ۔ اور میں بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں ۔

میں اس کی عجیب و غریب باتوں سے عاجز آچکا تھا ۔ چاہتا تھا کہ گھر سے نکل بھاگوں ۔ اس نے اچانک خاموشی اختیار کر لی ۔ اس کا دبلا پتلا سینہ طوفانی سمندر کے مدوجزر کی طرح کانپ رہا تھا جیسے وہ مدت سے بیمار ہو ۔

میں اب چل رہا ہوں۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ سن رہے ہو۔" مگر اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اب بھی وقت ہے کسی بھی چیز کو پوشیدہ رکھے بغیر وہ سب کچھ کہہ ڈالو جو تمہارے دل میں ہے سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے مل کر تمہاری بے سر دپا باتوں کو سن کر ادھ مُوا سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کونسی گھڑی تھی جو میری تم سے ملاقات ہوگئی۔

مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ تم سے ملنے کے بعد........

میں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ اچانک ایک خطرناک قسم کی ابابیل کمرے میں داخل ہوئی اور پے در پے کمرے کے چکر لگانے شروع کر دیے۔

اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ایسا لگتا تھا جیسے اُس پہ ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی ہو۔

میرا دل خوف اور وحشت سے بے طرح کانپ رہا تھا لیکن وہ مطمئن تھا جیسے اس کے لیے یہ روز کا معمول ہو۔

گھبراؤ نہیں ——— یہ تمہیں ضرر نہیں پہنچائے گی۔ یہ ابابیل یہاں روز آتی ہے اور اپنے مقررہ چکر کاٹنے کے بعد یوں ہی چلی جاتی ہے۔ مگر دیر سے آئی ہے نا تو چکر بھی اسی تیزی سے لگا رہی ہے۔

لو اب وہ چلی گئی ——"

واقعی ابابیل کمرے سے جا چکی تھی۔

وہ اضطراری کیفیت جو اچانک ابابیل کے آجانے سے مجھ پر طاری ہوگئی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی خاموشی کا لبادہ اوڑھے میری جانب عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

اب بھی وقت ہے، وہ ساری باتیں کہہ ڈالو۔ جس کے لیے مجھے تم یہاں گھسیٹ لائے تھے۔ سُن رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" لیکن وہ پھر بھی چُپ تھا۔ بُت کی طرح خاموش اور قبر کی طرح پُرسکون۔

میں بڑی مایوسی کے عالم میں اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔ ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور سڑک پر دور دور تک ہولناک سنّاٹا طاری تھا۔ اکا دکا لوگ بارش میں بھیگتے ہوئے سڑک پار کر رہے تھے۔ میں بارش سے بچنے کے لیے ایک سائبان کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

وہاں کافی اندھیرا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ دو تین اور لوگ بھی یہاں کھڑے ہیں۔

کسی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بجا ہوگا ــــ ؟"

"گھڑی بند ہے ــــ" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا

"تعجب ہے ــ ؟ وہ تو چل رہی ہے۔"

"لیکن سکنڈ کا کانٹا ــــ ؟"

وہ دُھواں دھواں سی سلگتی ہوئی شام اُسے آج بھی یاد تھی جب اس کھنڈر نما حویلی پر اُس نے پہلی بار دستک دی تھی ۔ ایک نہیں کئی بار ـــــ مگر حویلی کے در و دیوار خاموشی کا لبادہ اوڑھے کسی بے جان بُت کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے ۔ ہر طرح کی کوشش کے بعد جب .. کوئی شنوائی نہ ہوئی تو وہ مایوس ہو کر اس آدمی کی تلاش میں نکل پڑا تھا جس نے اسے اس کھنڈر نما حویلی کا پتہ بتایا تھا ۔

مگر دور دور تک اس کا کہیں پتہ نہ تھا ۔

آج پھر وہ اُسی حویلی کے دروازے کے قریب کھڑا تھا ۔ مگر دروازے کے منہ پر ایک بڑا سا تالا پڑا تھا ۔ ایک زنگ خوردہ عجیب و غریب تالا ـــــ وہ بڑی دیر تک دروازے کے منہ میں دھنسے اس بے ڈھنگے بدصورت تالے کو بغور دیکھتا رہا ۔

یہ تالا کبھی کھلے گا بھی یا اسی طرح .... وہ سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا ۔

اچانک اسے لگا جیسے دور کسی خاردار جھاڑیوں میں پھنسا ہوا آدمی زخمی لہجے میں آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہو ۔

بند دروازوں پر دستک دینا ہی آدمی کا مقدّر ہے ۔

اس نے آنکھیں پھاڑ کر خاردار جھاڑیوں میں پھنسے آدمی کو دیکھا جو اپنی ذات کی آگ میں سلگتا ہوا آپ ہی آپ جل رہا تھا ۔ مگر اُسے تو اس اجنبی کی تلاش تھی جس نے اُسے ...
یہ سوچ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے چل پڑا ۔ اُسے یک بارگی احساس ہوا کہ وہ جس سڑک پر چل رہا ہے ۔ اس کے سینے سے لہو کی بوندیں آہستہ آہستہ ٹپک رہی ہیں ۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرانی

ہوئی کہ لہوئیں ڈوبی ہوئی اس سڑک کے آخری کنارے پر وہ اکیلا بیٹھا اطمینان سے سگریٹ کے پے درپے کش لگا رہا ہے۔

ابھی وہ اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اچانک بول پڑا۔

کسی کے گھر دی ہوئی دستک کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ مگر تم حویلی کا دروازہ توڑ نہیں سکتے کہ تم ایک اچھے نہیں شریف زادے ہو۔ میں جانتا ہوں تم یہاں یہی کہنے آئے ہو کہ وہاں کسی نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی۔ شاید وہاں وہ بوڑھا نیند کے پنگوڑے میں پڑا بے سدھ سو رہا ہو۔ مگر نہیں اُس بوڑھے کے کانوں تک تمہاری دستک کی بیمار آواز نہ پہنچی ہو۔

تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب مقدر یاوری پر اُتر آئے۔ ہو سکتا ہے اُس نے اپنا کاروبار ترک کر دیا ہو۔ کسی بھی یکسانیت سے آدمی جلد ہی اُوب جاتا ہے۔

مجھے ہی دیکھو۔ کل تک بندر چھاپ بیڑی پیا کرتا تھا۔ آج سگریٹ پی رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کل سگریٹ کی بجائے کوئی اور مہنگا یا گھٹیا نشہ کا عادی ہو جاؤں۔ مگر ان باتوں.... تمہارا کیا تعلق۔

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ایک ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں تم سکھ اور شانتی سے رہ سکو۔ سکھ اور شانتی کا مطلب سمجھتے ہونا۔؟

اب اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ رینگ آئی تھی وہ بڑی قاتلانہ تھی۔ مگر میں تو اس پرانی حویلی کی بات کر رہا تھا۔"

اب تک جو میں نے باتیں کیں۔ کیا وہ اس حویلی کے بارے میں نہیں تھیں۔ اگر نہیں تھیں تو وہ حویلی کی پیشانی پر سنہری تختی کا آویزاں رہنا۔؟

اس کی گفتگو کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ ایک آوارہ لونڈا درمیان میں آ ٹپکا۔ چھٹا ملے گا میرے پاس پچاس کا ایک نوٹ ہے۔ اس نے جب دوبارہ یہی ہانک لگائی تو وہ چیخ پڑا۔ ابے سالے اِدھر کیوں مرنے چلا آیا۔ دیکھتا نہیں ایک اہم گتھی سلجھتے سلجھتے رہ گئی ہے۔ جب لونڈا منڈیر پھاند کر آگے نکل گیا تو اس نے اطمینان سے کہا۔

تمہیں گھر۔۔۔ ٹھکانہ۔۔۔ سائباں سب کچھ مل جائے گا۔ مگر کمزور اور ناتواں دستک

سے کام نہ چلے گا۔

مگر وہ وہی جگہ تو تھی جہاں تم نے جانے کا مشورہ دیا تھا۔"

میں نے تمہیں راستے کی نشاندہی کی تھی۔ منزل کا پانا یا نہ پانا یہ تمہارا مسئلہ ہے۔

اب اسے اچانک احساس ہوا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے جس نے اُسے حویلی پہ پہنچ کر دستک دینے کو کہا تھا۔ یہ اُسی کی قبیل کا کوئی دوسرا آدمی ہے جو بڑا کائیاں ہے مگر اس کا چہرہ تو ہو بہو وہی ہے۔ نہیں نہیں یہ کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے۔ یہ وہی ہے تو پھر وہ کون تھا جس نے اُسے.....

اب وہ ایک عجیب اضطراری کیفیت سے دوچار سڑک پہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن وہ سینہ تانے پھر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اس حویلی میں دوبارہ قدم رکھوں۔ مگر تمہاری خاطر یہ بھی گوارہ ہے یہ کہہ کر اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے کندھوں کو پیار سے یوں تھپتھپایا جیسے وہ اسی کی ذات کا ایک اہم حصہ ہو۔

اب وہ ایک آسیب زدہ انسان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آج یہ سڑکیں مجھے کچھ زیادہ ہی زخمی لگ رہی ہیں۔ دیکھو لوگ کتنے کم کم دکھائی دے رہے ہیں اور کس قدر حیراں و خوف زدہ ——— میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

زمین پہ انسانی قافلوں کا بڑا بوجھ ہے۔ اُسے وقتاً فوقتاً زخمی ہونا ہی چاہیے۔ تم ان باتوں پہ غور کرنے لگو گے تو کینسر میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہ المیہ ہی کیا کم ہے کہ ہم جی رہے ہیں۔ خواہ وہ کسی روپ میں کیوں نہ ہو۔

پھر اس کے ساتھ وہ کب اور کس طرح اس پرانی حویلی میں داخل ہوا اسے کچھ یاد نہ تھا جیسے کچی نیند میں اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

وہ بڑے بڑے دیو ہیکل ویران سے کمرے۔ وہ عجیب و غریب دلان اور اس پہ بچھی ہوئی کئی گرد آلود دریاں ——— پلنگوڑے میں چپ چاپ لیٹا ہوا وہ سفید براق سا بوڑھا ———

قدرے کھلا ہوا منھ اور پپوٹوں میں چھپی ہوئی وہ ادھ کھلی آنکھیں۔ صحن میں لٹکا ہوا وہ زنگ خوردہ پنجرہ۔ جس میں ہرے رنگ کا ایک منحوس طوطا جو مسلسل ٹرٹرا رہا تھا۔ بھاگ جا ــــ بھاگ جا ــ "

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حویلی کے در و دیوار پہ چمٹے ہوئے بے شمار زہریلے کیڑوں کو رینگتے ہوئے دیکھا۔ یکبارگی اُسے لگا جیسے سارے زہریلے کیڑے اس کے جسم سے چمٹ گئے ہوں۔ پھر اچانک ہوا کا ایک طوفانی جھونکا آیا۔ اور ڈولتے ہوئے پنجرے سے وحشت زدہ طوطے کی کریہہ آواز ابھری۔

بھاگ جا ــ بھاگ جا ــ "

اُسے قریب ہی ایک بھاری پراسرار آواز سنائی دی۔

اب آگئے ہو تو گھبراؤ نہیں یہ پاگل طوطا تو ہمیشہ یوں ہی ٹرٹراتا ہے۔"

زہر

"بہت بری خبر ہے۔" سلیم نے ڈرائنگ روم میں اچانک داخل ہوتے ہوئے کہا۔"
"کبھی تم نے اچھی خبر بھی سنائی ہے۔"
"سنو شوکت کی بیوی نے زہر کھا لیا ہے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں۔"
وہ کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جیسے سلیم کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔
"سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟"
"میں نے خبر سن لی ہے اب تم جا سکتے ہو۔"
سلیم ہکا بکا اسے بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔
"مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ اسے زہر کھانا ہی چاہیے تھا۔"
"مگر کیوں؟ شوکت تو اسے بہت چاہتا تھا۔"
"صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم یہ بات نہ سمجھ سکو گے۔ مجھے بور نہ کرو۔"
یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔
سلیم تھوڑی دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ جب سلیم چلا گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ تپائی پر دھرے ہوئے سگریٹ کیس سے گولڈ فلیک کی ایک سگریٹ نکالی اور ایک لمبا کش لے کر سوچنے لگا۔ "یہ سلیم سالا ایسی خبریں سنانے سے پہلے مرتا کیوں نہیں۔"
مگر یہ شام آج اسے دھواں دھواں سی کیوں لگ رہی ہے۔ اسے یہ کیوں احساس ہو رہا ہے جیسے افروز کی بجائے اس نے زہر پی لیا ہے۔

کم بخت نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ رضا کی پارٹی بھی گئی۔ کتنے دنوں بعد جانی واکر پینے کو مل رہی تھی مگر یہ کیا ٹیلی فون بوتھ کی طرف اس کے قدم کیوں اٹھ رہے ہیں۔ آخر یہ چمکیلے شیشوں والا بوتھ کا دروازہ کس نے بھیڑ لیا ہے۔

پیٹ می آن ٹو جنرل ہاسپٹل پلیز

ہیلو۔ کیا مسز شوکت۔"

ہاں وہ بچ نہ سکیں۔"

وہ کب گھر لوٹا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ اُسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔

دوسری صبح جب سلیم پھر آدھمکا تو اسے احساس ہوا جیسے وہ اسے مار کر ہی دم لے گا۔

تم جانتے ہو۔ میں ہائی پر ٹینشن کا مریض ہوں۔"

ہاں یہ تو عام بیماری ہے۔"

پھر خاص بیماری کیا ہوتی ہے۔"

شخصیت سے فرار ——"

یہ بھی کوئی بیماری ہے — "؟

بیماری نہیں مرض —— بہت پیارا اور خوبصورت جس نے تمہیں جکڑ رکھا ہے۔

تم مسز شوکت کی موت پہ آزردہ ہو۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔"

کیا بک رہے ہو۔ ؟"

مگر سلیم کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔

یہ مردود جب بھی آتا ہے۔ اس کا بی پی بڑھ جاتا ہے۔ سالا مرتا بھی تو نہیں ——

جب وہ ایک طویل عرصے تک اس سے ملنے نہیں آیا تو اس نے پھر ایک بار اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کسی نے اُسے بتایا کہ وہ یہ شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہے اُسے بھی یقین ہو گیا۔ جو آدمی دید کا بار اٹھانے کے لیے روز اس کے گھر آتا ہو اگر وہ تین برس کی لمبی مدت تک نہ آئے تو اس کا یوں مطمئن ہو جانا واجبی ہی تھا۔ لیکن اس کی خوشی پہ پانی پھیرنے کے لیے ایک دن پھر اس نے اس کے گھر دستک دی۔

وہ ان تین برسوں میں ذرا بھی بدلا نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماہ و سال کا اس پر کوئی بھی اثر نہ ہوا ہو۔

آتے ہی اس نے حسبِ عادت طنز آمیز لہجے میں کہا ۔

حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو ۔"

کیا مطلب ؟" مطلب یہ کہ تمہیں اب تک مر جانا چاہیے تھا ۔

تم میری جان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو ۔ مرنا اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو پہلے میں تمہیں مار کر مر گیا ہوتا ۔"

مجھے مارنے سے تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوگا ۔ کیوں کہ میری پیدائش خود میرے لیے ایک حادثہ ہے ۔"

ٹھیک ہے لیکن تمہارے گناہوں کا کفّارہ میں کیوں ادا کروں ۔ میری بچی کچی زندگی خود میرے لیے ایک کفّارہ بن چکی ہے ۔ مزید خون بہا کی مجھ میں سکت نہیں ہے ۔ اس لیے تم جب بھی مجھ سے ملو تو یہ بھولو کہ میں نے ابنارمل لوگوں سے ملنا تقریباً ترک کر دیا ہے ۔ کیا تم میرے برتاؤ سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں تمہیں کتنے فاصلے پہ رکھنا چاہتا ہوں ۔"

دوری اور قرب کے زہر کو میں پہلے ہی پی چکا ہوں ۔ اب میرے لیے قرب اور فاصلہ دونوں برابر ہیں ۔ مگر میں تو یہاں تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ افروز کی قبر کتبہ سے محروم ہے ۔ آج تک کسی نے اس قبر پہ کتبہ نصب نہیں کیا ۔"

یہ شکایت تمہیں اس کے شوہر سے کرنی چاہیے ۔"

قاتل کبھی مقتول نہیں ہوتا ۔ یہ اور بات ہے کہ مقتول قاتل ہی کا ایک روپ ہے ۔ ہر مقتول کے ساتھ ایک قاتل وابستہ ہے اور ہر قاتل کے ساتھ ایک مقتول ۔"

مجھے گنتی نہیں آتی ۔"

لیکن حساب بے باق اسی صورت میں ہوتا ہے جب گنتی صحیح ہو ۔

شوکت نے بالکل سچ کہا تھا کہ حساب کے معاملہ میں تم ایک مارواڑی سے بھی آگے ہو"

وہ خلافِ توقع چپ ہو کر رہ گیا ۔ جب سلیم اسے روندتا ہوا چلا گیا تو اس نے منہ ہی

منہ میں ایک موٹی گالی دی۔ اور گھر سے بے ارادہ نکل پڑا۔ پھر اچانک ایک سکوٹر اس کے سامنے آکر رک گئی۔ دراصل سکوٹر میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی تھی ورنہ وہ جگہ ایسی نہ تھی کہ اس نوجوان کو بریک لگانے کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے نوجوان کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ سڑک کے آخری سرے سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

ایک عجیب کشمکش، تناؤ اور بے چینی سے دوچار اس نے سوچا۔

کوئی فلم ہی کیوں نہ دیکھ لی جائے۔ سامنے ایک سینما ہال تھا۔ دس بج چکے تھے۔ شاید فلم شروع ہو چکی تھی۔ مگر بکنگ پر ویرانی برس رہی تھی۔ اس نے ونڈو پر پہنچ کر اپر کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا۔ سینما ہال میں اندھیرا ڈول رہا تھا۔ مگر پردے پر روشنی تھی۔ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دس منٹ اپنی سیٹ پر جما رہا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مگر اُسے یہاں بھی بڑی گھٹن کا احساس ہوا۔

وہ سینما ہال سے باہر آگیا۔

تارکول کی لمبی اُداس اور گونگی سڑک آج اسے ایک ویران قبرستان کی طرح لگ رہی تھی اور وہ کئی بے جان قبروں کے بیچ اپنے کندھے پر ایک بے نام کتبے کو اٹھائے چل رہا تھا۔!!

ہیں خواب میں ہنوز

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ آدمی ابھی تک نیچے چپ چاپ کھڑا تھا۔ ابھی ابھی جب اس نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہے اور شب بسری کے لیے ایک رات اس کے گھر میں گزارنا چاہتا ہے لیکن اس کے انکار کے باوجود وہ ابھی تک نیچے کھڑا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور وہ خود اس محلے کے لیے زیادہ شناسا نہ تھا۔ کچھ دن پہلے ہی اس نے یہاں سکونت اختیار کی تھی۔ ایسے میں شب بسری کے لیے کسی بھی اجنبی کو جگہ دینا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سردی ہولے ہولے بڑھ رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ بند کھڑکیاں تیز ہوا کے دباؤ سے خود بخود کھل رہی تھیں۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دبے پاؤں کوئی طوفان آنے والا ہو۔ قریب کے کمرے میں اس کی بیوی نیند میں غرق تھی۔ کمرے کی لائٹ آف تھی اس لیے کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے اندر جا کر لائٹ آن کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اس کی نیند خراب ہو جائے مگر اس آدمی نے اسی کے گھر کا انتخاب کیوں کیا؟... لیکن وہ اب تک تو چلا گیا ہوگا۔ کسی آشرم کے کمرے نے اس کے لیے اپنی آغوش وا کر دی ہوگی وہ یہ سوچ کر اطمینان سے اس دریچے کی طرف بڑھا۔ جہاں سے وہ نیچے دیکھ سکتا تھا۔

اسے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔ وہ کب کا چلا گیا ہوگا۔ یہ بات اس نے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ اور کھڑکی تک نہ جانے کا جواز اس نے اپنے طور پر ڈھونڈ لیا تھا۔ پھر یوں بھی ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ اسے کھڑکی کے مقابل ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

بس ایک رات کی بات ہے کسی کونے میں پڑا رہوں گا اور پھر دم چلا جاؤں گا۔ کتنی راتیں ہیں جن کی کبھی صبح نہیں ہوتی۔ مگر یہ عجیب رات ہے جو کچھوے کی طرح رینگ رہی ہے۔ وہ جی کڑا کر کے کھڑکی کے قریب آیا۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ وہ ابھی تک نیچے چپ چاپ کھڑا تھا۔ سڑک پر اکا دکا موٹر کاریں دوڑ رہی تھیں۔ چند لوگ سمنٹ کی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

بازار کی بیشتر دوکانیں بند ہو چکی تھیں اور سڑک پر کہیں روشنی تھی اور کہیں اندھیرا۔ اس نے سوچا پولیس کو فون کیا جائے کہ اس کے گھر کے نیچے ایک مشتبہ آدمی کئی گھنٹوں سے کھڑا ہے۔ اُسے اپنی جان و مال کا خوف ہے ..... لیکن پولیس اتنی سی بات پر تھوڑا ہی ایکشن لیتی ہے ...... مگر وہ اپنے خط و خال سے بھی بھلا مانس لگتا ہے کپڑے بھی صاف ستھرے پہن رکھے ہیں۔ گفتگو میں مٹھاس اور نرمی بھی ہے .... آدمی تو کئی پردوں میں چھپا رہتا ہے۔ جگہ نہ دینے ہی میں عقلمندی ہے۔ جگہ کے لیے تو ساری دنیا پریشان ہے۔ شیلٹر کب کہاں اور کسے ملا ہے۔

اب وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنی بیوی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس کی بیوی ابھی تک سو رہی تھی۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ شاید گہری نیند سو کر وہ اسے یہی بات سمجھانا چاہتی ہو۔ شاید جلد سو کر وہ یہ بات بھی اس کے ذہن نشین کروانا چاہتی ہو کہ نیند کے ساتھ ساتھ وہ اور بہت سی باتوں میں خودمختار ہے۔ مگر وہ بھی تو چپکے سے اس کے قریب جا کر سو سکتا ہے۔ جاگنے کے لیے اگر وہ آزاد ہے تو سونے کے لیے بھی اس کی آزادی برقرار رہے گی۔ وہ یوں ہی ٹہلتا رہا۔ اس کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ اب نہ خود سو سکتا تھا اور نہ اپنی بیوی کو جگا سکتا تھا۔

اس کا ذہن منتشر تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے گمان سر اونچا کیے جھانک رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں اسی طرح ٹہلتا رہا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی طرف اس کی نگاہیں اٹھ جاتیں تو اسے بے اختیار اس اجنبی کا خیال آتا۔ اجنبی کے خیال کے ساتھ ہی اس کی طبیعت دگرگوں ہو جاتی۔

آج اسے دو باتوں کی بڑی کوفت تھی۔ اجنبی کا خواہ مخواہ مکان کے نیچے ٹھہرا رہنا۔

بیوی کا وقت سے پہلے سو جاتا۔ ان دونوں نے جیسے اس کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ اس نے دل میں سوچا اگر اجنبی اب بھی اس کے مکان کے نیچے کھڑا نظر آئے تو وہ اسے لڑائی کے لیے للکارے گا۔ اسے اوپر سے ایک موٹی سی گالی دے گا اور کہے گا بدمعاش یہاں سے فوری دفع ہو جا۔

وہ تیز تیز قدم ڈالتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ اس نے دیکھا وہ نوجوان اب الکٹرک پول سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ سونے والے کو کیا گالی دی جائے۔ رات تو آدھی ڈھل چکی ہے۔ گجر دم وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر پھر ایک بار بغور اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ہاتھ پاؤں بالکل ساکت تھے۔ شاید وہ گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر کھڑکی کے پاس ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ جاگے تو اسے للکار سکے۔ لیکن وہ بدستور سو رہا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے آہستہ آہستہ اپنی بیوی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس کی بیوی کے کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ نیند میں غرق تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔

اس کا ذہن اب کچھ کام کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ اپنے بستر پہ آکر دراز ہو گیا۔

اس نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ اس پہ نیند نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ اس کی مندی مندی آنکھوں میں نیند ننھے منے قطروں کی طرح جمنے لگی اور ایک حد ایسی آگئی کہ وہ سو گیا۔

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

صبح کی سفیدی در و دیوار پہ پھیل رہی تھی۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے اس اجنبی کا خیال آیا جو رات گئے الکٹرک پول سے ٹیک لگائے سو گیا تھا۔

یکبارگی وہ بستر سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس آ پہنچا۔ اس نے دیکھا پول کے نیچے ایک مریل سا کتا پیشاب کر رہا تھا۔

وہ جا چکا۔ چلو ایک الجھن سے نجات تو ملی۔ وہ یہ سوچ کر بڑے اطمینان سے اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ جانے کیوں اس کا سر چکرا گیا۔ وہ اپنی پریشانی اور اداسی کا جواز بھی نہ ڈھونڈھ سکا۔ چور نظروں سے اس نے پھر

اپنی بیوی کو دیکھا ۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ غازہ چہرے کو کچھ عجیب طرح سے چھوڑ رہا تھا۔ کاجل آنکھوں میں پھیل کر رہ گیا تھا ۔

اس نے کچھ سوچ کر سگریٹ جلایا اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا ۔ جس سے وہ ابھی ابھی لوٹا تھا ۔ لمبا کش لے کر سگریٹ کے دھویں میں جھانکتے ہوئے وہ سوچتا رہا ۔ کیا میں واقعی رات سوتا رہا تھا یا پھر ـــــ

لیکن اس کی بیوی اطمینان سے سو رہی تھی !!

چوتھا آدمی

اس نے اکثر سڑک کے کنارے کسی بے سہارا آدمی کی نعش کے اطراف چند آدمیوں کو دیکھا تھا جو نعش کے قریب کھڑے کفن دفن کے لیے چندہ مانگا کرتے تھے۔ کبھی کبھار یہ لوگ آنے جانے والوں کا راستہ بھی روک لیا کرتے تھے تاکہ وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہوں۔ مگر وہ واحد آدمی تھا جس نے اب تک اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی نہیں دیا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ نعش کا بھی بیوپار کرتے ہیں۔

آج اُسے بڑا اچھنبا ہوا کہ نعش سڑک پر نہیں تھی بلکہ ڈولے میں پڑی سڑ رہی تھی لوگ پیسے نہیں مانگ رہے تھے بلکہ انھیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو صرف کندھا دے سکے۔ ڈولے کو سہارا دینے کے لیے چار آدمیوں کی ضرورت تھی اور وہ کل ملا کر تین خستہ حال آدمی تھے جنھیں ایک اور خستہ حال آدمی کی ضرورت تھی۔ چوتھا آدمی ایک لمحہ کے لیے ڈولے کے سامنے آکر رک گیا تو تینوں خستہ حال آدمیوں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ ایک آدمی نے اس کے ہاتھ پہ بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر وقت پوچھا۔ اس نے جب وقت بتایا تو تینوں آدمیوں کے چہرے اُداسی سے لٹک گئے۔

"کیا بات ہے یہ ڈولا یہاں سے کیوں نہیں اٹھتا۔"

"ڈولے کو سہارا دینے کے لیے صرف ایک آدمی کی ضرورت ہے اور صبح سے ہمیں ایک آدمی بھی نہیں مل رہا ہے جو اس کار خیر میں ہمارا ساتھ دے۔"

"قبرستان یہاں سے کتنی دور ہے۔" چوتھے آدمی نے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

"یہی دو ایک میل مگر ڈولا اٹھنے پر کوئی نہ کوئی تو مل ہی جاتا ہے۔ بس کسی چوتھے آدمی

کا کندھا اگر مل جائے تو یہ نیکی کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔"

چوتھا آدمی شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے ڈولے میں جھانک کر نعش کو دیکھا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا سوجھی۔ یکبارگی کہہ اٹھا۔ "چلو ہم کندھا دیتے ہیں"۔ بسم اللہ کہہ کر وہ تینوں خستہ حال آدمی اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب وہ چاروں ڈولے کو اٹھائے سڑک پار کر رہے تھے۔ وہ مختلف گلیوں، راستوں سے گزر رہے تھے۔ جنازے کو دیکھ کر لوگ یوں بدک رہے تھے جیسے یہ کبھی مریں گے ہی نہیں"۔

وہ جنازے کو تھامے مسلسل چل رہا تھا۔ اب اس کا کندھا جواب دے رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اُسے اپنا ایک ایک قدم من من بھر وزنی لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ اور کندھے کے درمیانی حصے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

"آخر قبرستان کب آئے گا۔" اس نے مایوسی سے پوچھا۔

"بس ذرا اور تکلیف اٹھا لیجئے۔" بیک وقت تینوں آدمیوں نے جواب دیا جیسے وہ بھی کافی تھک گئے ہوں۔"

یہ تکلیف اب اس کے لیے عذاب بنتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ تینوں خستہ حال آدمیوں کو گالیاں دے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ دور دور تک کہیں بھی قبرستان کا پتہ نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا آدمی زندہ رہ کر بھی لوگوں کے لیے عذاب رہتا ہے اور مر کر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایک لمحہ بعد ہی اس نے منہ ہی منہ میں اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ توبہ توبہ آج کیسے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے ہیں۔ راستہ کسی طرح کٹ نہیں رہا تھا۔ وہ تینوں نعش کے بوجھ کو کندھے پر اٹھائے بڑی مردہ دلی اور مایوسی کے ساتھ تھکے تھکے قدم ڈالے آگے بڑھے جا رہے تھے اب تو چاروں آدمیوں کے چہرے یوں لگ رہے تھے جیسے یہ آدمی نہیں بھوتوں کے سائے ہوں۔

اب چوتھے آدمی پر تھکن کچھ اتنی طاری ہو چکی تھی کہ اُسے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ چل بھی رہا ہے یا اس کے قدم زمین ہی سے اوپر کہیں معلق ہو گئے ہوں۔ اس نے ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے ایک جملہ بھی نکل نہ سکا۔

تینوں خستہ حال آدمیوں نے یہ بات تاڑ لی کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن تھکن اور بھوک

اس پر کچھ اس طرح طاری ہے کہ وہ اب بات کرنے سے بھی مجبور ہے۔ صرف لمبے لمبے سانس ہی کے ذریعہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ قطع نظر اس کے ان تینوں خستہ حال آدمیوں کا بھی بھوک اور تھکن سے بہت برا حال تھا۔ انھیں بھی احساس ہو رہا تھا کہ نیکی اب ان کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ صبر اور تحمل کی منزلیں اب معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ان تینوں آدمیوں میں سے کسی نے بیمار آواز میں کہا۔

"وہ دیکھو قبرستان نظر آرہا ہے۔"

چوتھے آدمی کی آنکھوں میں امید کے موہوم چراغ جھلملانے لگے لیکن وہ اب بھی شک اور یقین کے دوراہے پر کھڑا تھا۔

اب واقعی قبرستان کی دیواریں انھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جب تھکے تھکے نڈھال سے قبرستان کے کمپاونڈ میں داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ ان تینوں خستہ حال آدمیوں نے بسم اللہ کہہ کر جنازے کو قبرستان میں یوں رکھا جیسے وہ اب اپنا فرض ادا کر چکے ہوں۔

پھر چوتھے آدمی نے متحیر لہجے میں کہا۔

"ارے بھائی یہ تو اپنا قبرستان نہیں ہے۔" !

دعا

میں نے جس آدمی کو برسوں دیکھا۔ وہ ان دنوں پتہ نہیں کہاں غائب ہے۔ آپ نے
بھی اگر اسے کہیں دیکھا ہو تو کم و بیش وہی خلش اپنے دل میں محسوس کر رہے ہوں گے جو میں نے
محسوس کی ہے۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو۔ آپ نے اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اگر تھوڑی
دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ نے اُسے دیکھا تھا۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اُس کی
شخصیت کے سارے خد و خال آپ کے ذہن کے پردے پر اسی طرح متحرک ہوں جس طرح
ابھی ابھی میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ہر شخص کی ذہنی سطح یکساں تو نہیں ہوتی کہ وہ بہتے
پانی کی طرح کسی سنگم میں پہنچ کر اپنی عافیت سنبھالے۔ پھر بھی انیس بیس کا فرق رہے گا ہی۔
اس فرق کو نہ آپ مٹا سکیں گے اور نہ میں۔ تفریق کا یہ ناگ ازل سے ہمارا پیچھا کر رہا ہے
میں آج جس آدمی کے بارے میں لکھنے جا رہا ہوں۔ کبھی میں نے بھی اس کا پیچھا کیا تھا۔
ان اسرار کو جاننے کی کوشش کی تھی جو اس کی ذات کے نہاں خانے کا ایک حصہ تھا۔ لیکن میری
اس ساری کوشش کو وہ اپنے پاؤں تلے یوں دبا دیتا جیسے وہ آدمی نہ ہو کوئی قلندر یا ولی ہو
یا بہت بڑا ساحر ہو۔ بہر حال وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا اور بہت کچھ ہوتے
ہوئے بھی کچھ نہ تھا۔

میں نے پہلی بار اُسے شاہ صاحب کے تکیے سے لگے ویران و خستہ حال قبرستان میں دیکھا
تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہوتے ہوئے بھی الگ سا دکھائی دے رہا تھا۔

جنازے کو قبر کے منھ میں پھینک آنے کی رسم ادا کرنے کے بعد جب وہ لوگ پیچھے ہٹنے لگے تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ خوانی اور دعا کے لیے اٹھا دیے۔
اس کے ملگجے ہونٹ آہستہ آہستہ یوں پھڑک رہے تھے جیسے وہ مرحوم کی بخشش کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا ہو۔
مرنے والے کو دفن کرنے کے بعد جو گروہ تیز تیز قدم اٹھاتا قریب کی ٹوٹی ہوئی سڑک تک پہنچ چکا تھا۔ ان میں اس کے سبھی بھائی بند تھے۔ ڈر اور خوف کی چادر اوڑھے ہوئے ایک انجان اور نامعلوم وسوسے میں گرفتار۔
" ارے بھئی ذرا رکنا ___ میری آواز قبرستان کے سناٹے میں سرسرا سی گئی۔ لیکن وہ لوگ آگے بڑھتے ہی گئے۔
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آدمی ابھی تک فاتحہ خوانی میں مشغول تھا۔
اور اب اس گروہ کے بیشتر لوگ قبرستان سے لگے ہوٹل میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ جیسے وہ موت کے پھندے کو گلے سے نکال کر اسے کہیں دور پھینک آئے ہوں۔ جس کھنڈر میں جہاں ابھی ابھی وہ باادیدہ تر تھے۔ اب ان کے ہونٹوں پر زندگی کی مسکان تھی۔
ہو سکتا ہے جو میں نے دیکھا ہے وہ غلط ہو۔ لیکن تیسری آنکھ کبھی دھوکہ نہیں کھاتی۔
قبرستان میں بچھی ہوئی یہ ٹیڑھی میڑھی قبریں، اس پہ پھولوں کی بجائے جابجا پرندوں کی بیٹ۔ یہ بیمار اور خستہ دیواریں، صدیوں پہلے لگائے ہوئے یہ دو چار بوڑھے درخت یہ خودرو جھاڑیاں اور اس پہ رینگتے ہوئے یہ عجیب وغریب کیڑے۔
میں نے لوٹنے سے پہلے پھر ایک بار پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ آدمی ابھی تک فاتحہ خوانی میں مشغول تھا۔ میں اس کے چہرے کو اس لیے بھی دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اس کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ صرف اس کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ اور دعا کے لیے اٹھے ہوئے اس کے دو ہاتھ۔
میں نے سوچا۔ آخر وہ کب تک اس طرح کھڑا رہے گا۔ یہ دعا دے رہا ہے یا شخص مرحوم سے ہمکلام ہے۔ ایک لمحہ بعد ہی میں نے ایک سیاہ زہریلے ناگ کو جھاڑیوں میں

سے نکلتے دیکھا۔ میں وحشت سے لڑکھڑا سا گیا۔ اب میرے سامنے ناگ کی شکل میں کھڑی تھی۔

" دیکھ لیا نا ___ ویران قبرستان میں جانے کا انجام۔ اب بھگتو ناگ کے کاٹے کا کوئی علاج بھی ہے ___؟ جیسے میرے اندر کے انسان نے کہا۔

" نہیں نہیں ___ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بچا لو۔ مجھے بچا لو۔

میں کب اس ویرانہ سے واپس لوٹا مجھے کچھ یاد نہیں ___ میں نے مُندی مُندی آنکھوں سے باہر دیکھا۔ وہ لوگ ابھی تک ہوٹل کی کرسیوں پر ڈٹے ہوئے تھے۔

میں جیسے تیسے ہوٹل میں داخل ہوا۔ بیرے نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما۔

" بابو صاحب ___ چائے یا کافی ___"

" چائے اور کچھ سموسے بھی ___"

" سموسے تو ان سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں نے ختم کر دیئے ___"

" کچھ بسکٹ تو ہوں گے ہی ___"

" وہ بھی نہیں ___"

کیا وہ بسکٹ بھی وہی لوگ ___؟

" خوب کھاتے ہیں صاحب ___ اسی لیے تو زندہ ہیں ___؟

دیکھو صاحب وہ لوگ اِدھر ہی دیکھ رہے ہیں۔

دیکھنے دو ___ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

بیرہ ___ منیجر کی گرجدار آواز گونجی۔

اس بیرہ کھڑا کیا کر رہا ہے۔ دیکھ وہ کنارے والا بابو کب سے چائے کے لیے پکار رہا ہے۔ بیرہ جب بڑی شتابی سے آگے بڑھ گیا تو میں نے دیکھا۔ وہ لوگ کپڑے جھاڑ کر یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اچانک انھیں کوئی اہم کام یاد آگیا ہو ___ ایک ایک کر کے جب وہ سب جا چکے تو میں نے بھی باہر نکلنے میں نجات محسوس کی ___ مگر وہ سامنے کے پان واڑی سے اپنے اپنے لیے پان بنوا رہے تھے۔ میرے ہاں سگریٹیں ختم ہو چکی تھیں ___

ہوٹل کی کسیلی چائے نے جس انداز سے منھ کا مزا بگاڑا تھا۔ اس کے لیے سگریٹ کے دو چار لمبے کش لگانے ضروری تھے ایک پیکٹ نور اسکوائر۔"

"ابھی دیا صاحب ۔ پہلے انھیں پان دے دوں ۔ ارے ہاں نور اسکوائر تو نہیں ہے صاحب۔"

"تو پھر جانے دو ۔ آگے کہیں دیکھ لیں گے۔"

"ٹھہریے ۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کی خدمت میں نور اسکوائر کا ایک سگریٹ پیش کر سکتا ہوں ۔ اسی گروہ کے ایک نوجوان نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

"جی نہیں ـــ شکریہ ۔ میں مانگے تانگے کی سگریٹ نہیں پیتا۔"

"یہ زندگی بھی تو اُدھار مانگی ہوی ہے ۔ جس کا قرض آج نہیں تو کل ہمیں چکانا ہے۔ یہ تو ایک معمولی سگریٹ ہے ۔ خیر۔"

وہ جب آگے بڑھ گیا تو میں نے اُسے آواز دی ۔ "ذرا ٹھہریے۔"

وہ لپک کر میری طرف آیا۔ اس کے سارے ساتھی کچھ دور کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"آخر آپ مان گئے۔"

"نہیں ـــ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ آدمی کون تھا ۔ جو قبر کے قریب کھڑا ہاتھ پھیلائے فاتحہ خوانی میں مشغول تھا ۔ کہیں مرنے والے سے اس کا کوئی نازک رشتہ تو نہ تھا۔"

رشتہ وشتہ کچھ بھی نہیں ــ وہ ایک دوسرے کے لیے محض اجنبی تھے ۔ بالکل اجنبی ـ ہاں ہم سب اس کے قریبی عزیز تھے ۔ مگر یہ سب کچھ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

نہیں ـــ وہ آدمی مجھے بڑا بھلا لگا ۔ میں نے اسے ایک بار نہیں ۔ کئی بار اُسے اسی عالم میں دیکھا ۔ دعا کے لیے اوپر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔"

"ہاں میں نے بھی کئی بار اُسے اسی قبرستان میں دیکھا ۔ اور اسی روپ میں ۔ وہ مجھے کسی اور جگہ کبھی دکھائی نہ دیا۔

"ارے یاد آتا بھی ہے کہ نہیں ۔ وہاں کھڑا کھڑا کیا مغز پاشی کر رہا ہے ۔"

"وہ لوگ مجھے بلا رہے ہیں ۔ اب اجازت دیجئے ۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی ۔"

"کیا قبرستان میں ۔۔ ؟

"یہ بھی ہو سکتا ہے ۔

"مگر ہماری شہادت کون دے گا ۔"

اوپر والا ـــــــ "

میری عجیب و غریب کھوکھلی مسکراہٹ پر وہ ہنس پڑا ۔ اور اپنے ساتھیوں کیساتھ آگے بڑھ گیا ۔

میں نے اُسے دور تک جاتے دیکھا ۔ جب وہ ہجوم میں غائب ہو گیا تو میں نے بھی اپنے گھر کی راہ لی ۔

"ارے نفیس یہ کیا ۔۔ ؟ تم تو گھر کی چوکھٹ پر کھڑی ہو ۔ کیا کوئی خاص بات ۔ ؟

آج بڑی دیر لگا دی آپ نے ۔۔ مگر یہ آپ کے چہرے کو ہو کیا گیا ہے ۔ بڑے ملول لگ رہے ہو ۔ آخر کیا بات ہے ۔"

باتیں تو بعد میں ہوں گی ۔ پہلے مجھے سگریٹ چاہیئے ۔ کہیں تم نے چھپا کر رکھ دیا ہو تو فوراً لا دو ۔ ورنہ مجھے دوبارہ باہر جانا پڑے گا ۔"

اسی طرح ٹھہرے رہیئے ۔۔ میں دیکھتی ہوں ۔"

کیا سگریٹ کی ڈبیہ مل گئی ۔"

دیکھ تو رہی ہوں ـــ کچھ تو صبر کیجئے ۔"

نہیں نہیں ـــ میں بھی آتا ہوں ۔"

آنے کی ضرورت نہیں ـــ سگریٹ مل گئی ـ

سگریٹ مل گئی ـ چلو اچھا ہوا ـ نہیں تو میں مر گیا ہوتا ۔"

لیجئے سگریٹ ۔ اب اتنے لمبے لمبے کش لگائیے کہ گھر کے سارے کمرے دھوئیں سے اٹ جائیں ۔ میں نے سگریٹ جھپٹ کر دو تین لمبے کش لگائے اور دھیمے لہجے میں کہا ۔

آج میں بہت پریشان ہوں نفیس ۔ ایک نامعلوم سا خوف ایک بے نام سی اداسی میرے اردگرد گھوم رہی ہے ۔ اور میں ادھ موا سا ہوا جا رہا ہوں ۔ ،،

،، دن تو میں دیکھ رہی ہوں ۔ ،،

صرف دیکھنے سے کیا ہوتا ہے ۔ نفیس مجھے تمہارا سہارا چاہیئے ۔ تمہارا سہارا ۔ ،،

یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ۔ آج تک کبھی مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے ۔ ؟،،

نہیں نفیس ۔۔ یہ بات نہیں ۔ تم نہیں جانتیں ۔ میں کن زہریلی راہوں سے ہو کر آیا ہوں۔

وہ سیاہ ناگ ۔ وہ آدمی ۔ ؟

خدارا ۔ اب آپ آرام کیجئے ۔ دیکھئے آپ کا بدن بھٹی کی طرح جل رہا ہے ۔،،

تم فکر نہ کرو ۔ میں ابھی نہیں مروں گا ۔ مجھے وہ سب کچھ کہنے دو ۔ جو آج مجھ پر بیتی ہے ۔

کیا آج آفس کے منیجر سے پھر لڑائی مول لی ۔ ،، ؟

نہیں ۔۔۔ کاش میں آفس ہی چلا گیا ہوتا ۔

میں نے گھر سے نکلنے کے بعد راستے میں ایک جنازے کو دیکھا ۔ ڈولے کو صرف چار ہی آدمی کندھے پر اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے ۔ باقی ماندہ لوگ پیچھے تھے ۔ بہت پیچھے ۔۔ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ غائب ہو جانے والوں میں میں بھی ایک تھا ۔ لیکن پتہ نہیں جب میں نے اس آدمی کو دیکھا جو سفید دھاریوں والا کالا کرتہ اور ارک کا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنے سڑک پر ننگے پاؤں چل رہا تھا ۔ اس نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا کہ میں غائب ہونے والی ٹولی کی صف سے نکل کر جنازے کے آگے پیچھے چلنے لگا ۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے مجھ پر سحر کر دیا ہو ۔ اب میں اس اجنبی جنازے کا ایک جزو تھا جس سے میرا کوئی خونی رشتہ نہ تھا ۔ اور لوگوں کے ساتھ جب میں تکیہ والے شاہ صاحب کے قبرستان پہنچا تو گورکن قبر کی تازہ مٹی کی خوشبو سونگھ رہا تھا ۔ اس کے عزیزوں نے جب ڈولا قبر کے سینے پر رکھا تو میں احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا ۔ جنازے کو قبر میں اتارنے کے بعد جن لوگوں نے مٹی ڈالی ان میں ، میں بھی شامل تھا ۔ لوگ فاتحہ پڑھنے کے بعد ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے ۔ لیکن وہ آدمی اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ابھی تک قبر کے پاس کھڑا تھا ۔

پھر ایک سرسراہٹ سی میں نے محسوس کی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھ پر اچانک بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ جیسے کسی نے مجھے پیتھوڈین [PETHEDIN] کا انجکشن دے دیا ہو۔ مجھے لگا جیسے میں موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ مگر وہ زہریلا ناگ مجھے ڈسے بغیر جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ اور موت کی دہلیز کو پھلانگتا ہوا باہر آ گیا۔ بتاؤ نفیس یہ سب کچھ کیا ہے۔؟

"یہ محض تمہارا واہمہ ہے۔ تم اس جنازے میں گئے ہی نہیں۔ اور نہ تم تدفین کے وقت وہاں تھے۔"

کیا کہہ رہی ہو۔؟

آج تم معمول کے مطابق آفس گئے تھے۔ اور وہیں سے لوٹ رہے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم نے آج دیر زیادہ لگا دی۔"

"تمہیں یقین نہ آئے تو آفس فون کر کے پوچھ لو۔ وہاں کوئی نہ کوئی اوور ٹائم [OVER TIME] کرنے والا آدمی ضرور ریسور اٹھائے گا۔ اور کہے گا .... لو فون کی گھنٹی بھی بجنا شروع ہو گئی۔

ارے اتنی رات گئے کون بیوقوف فون کر رہا ہو گا۔ فون کی گھنٹی کی کرخت آواز مجھے بجو کے لگا رہی ہے۔ ذرا تم دیکھ لینا۔"

"ہیلو — جی — جی — نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آج ان کی طبیعت ناساز ہونے کے سبب وہ آفس نہ آ سکے۔ کل ضرور آ جائیں گے۔ اپنے مینجر سے کہنا کہ نفیس نے خود بات کی تھی۔"

"تم تو حقیقت کو بھی واہمہ سمجھنے لگی تھیں، اب ثبوت مل گیا نہ تمہیں — نفیس تم چپ کیوں ہو۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"پلیز — اب آپ سو جایئے۔ صبح ساری باتیں ہوں گی — شب بخیر۔"

—

سویرے جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ نفیس تخت پر بے سُدھ لیٹی تھی۔ اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے چند قطرے جیسے کانپ رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر جب رومال سے اس کے گالوں پر آئے ہوئے قطروں کو جذب کرنے کی کوشش کی تو وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ۔ دو ارے دھوپ تو آنگن تک چلی آئی ہے میں آپ کے لیے پہلے چائے بنا لاتی ہوں۔ آج ناشتہ میں شاید کچھ دیر ہو جائے ۔"

میں نے حسبِ عادت پہلے چائے پی ۔ بچے کچھے دو چار سگریٹ کے پھونک مارے ۔ نفیس کی پیشانی کو چوما ۔ اور آفس کے لیے نکل پڑا ۔ لیکن دل وسوسوں سے بھرا تھا کہ کہیں وہ آدمی پھر نظر نہ آجائے ۔ نظر بھی آجائے تو وہ میرا کیا بگاڑے گا ۔ میں نے دل کو ڈھارس دی ــــ دراصل میں خوف کے خول میں ابھی تک بند تھا ۔

پھر اچانک وہ مجھے سامنے سے آتا دکھائی دیا ۔ میرے کنی کاٹنے سے پہلے وہ سڑک پر پھیلے ہوئے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا ۔

پھر میں نے اسے کئی بار دیکھا ۔ ہر بار اسے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہا ۔ برسوں یہ تماشہ ہوتا رہا ۔ لیکن میں اندر ہی اندر جیسے ٹوٹتا جا رہا تھا ۔

پھر ایک دن شاید اس کی تیسری آنکھ نے مجھے دیکھ لیا ۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو ۔ لیکن یہ میرا وہم نہیں تھا ۔ اس نے سچ مچ مجھے دیکھ لیا تھا ۔

آج بھی وہ ایک جنازے کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا ۔ جنازے کو کاندھا دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی ۔ لیکن لگتا تھا جیسے یہ جنازہ کسی غریب یتیم اور یسیر کا ہو ۔

میں ایک غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر جنازے کے ساتھ اور لوگوں کی طرح چلنے لگا ۔ کبھی آگے ــــ کبھی پیچھے

لوگ جنازے کو قبر کے منہ میں پھینک کر چلے گئے ۔ لیکن وہ آدمی بدستور قبر کے قریب کھڑا ہاتھ پھیلائے دعا مانگ رہا تھا ۔

میں نے اضطراری کیفیت سے ادھر ادھر دیکھا ۔ اور دبے پاؤں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا ۔ اب میرے دونوں ہاتھ آسمان کی اور اٹھے ہوئے تھے ۔ غیر ارادی طور پر جب اس کے بازوؤں سے ٹکرا گیا تو اس نے وحشت ناک نگاہوں سے مجھے دیکھا ۔

اتنی لمبی دعا مانگنے کا حق تجھے کس نے دیا ۔ بول ۔ چپ کیوں ہے ۔ کیا تو مجھ سے بازی لے جانا چاہتا ہے ۔

ویران قبرستان کے ذرہ ذرہ میں اس کی آواز یوں گونج رہی تھی جیسے وہ ملبے کی چیخ ہو ۔ قبرستان کے سینے پر رینگنے والے سارے کیڑے مکوڑے اُچھل اچھل کر گر رہے تھے یا مر رہے تھے ۔ آسمان پر کالے کلوٹے کوؤں کی کائیں کائیں سے زمین پھٹی جا رہی تھی ۔ وہ مسلسل چیختا جا رہا تھا ۔ اتنی لمبی دعا مانگنے کا یہ حق تجھے کس نے دیا ۔ بول ۔ بولتا کیوں نہیں ۔ کیا زبان پہ تالے پڑ گئے ہیں ۔ سن نہیں رہا ہے مردود ۔ ،،

میں خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا ۔ لگتا تھا جیسے وہ زہریلا ناگ میرے جسم میں آہستہ آہستہ زہر کی بوندیں انڈیل رہا ہو ۔ مجھ پہ ایک غنودگی سی طاری تھی ۔ ایک عجیب سی غنودگی ۔

پھر وہ اچانک مجھ پر جھپٹ پڑا ۔ جیسے وہ آدمی نہیں جنگل کا کوئی خونخوار شیر ہو ۔ دفعتاً اس نے میرے اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا ۔ اس کے سیاہ ملگجے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رینگ گئی ۔

جا ۔ میں نے تجھے معاف کیا ۔ پھر اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیئے ۔ جیسے وہ خدا سے پھر ایک بار کچھ مانگ رہا ہو ۔

مردہ گاڑی

مردہ گاڑی کے اطراف لوگوں کا اژدھام تھا۔ ہسپتال کی سیڑھیوں پر بے شمار لوگ اور بھی تھے جو نعش کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایک بڑے بڑے بالوں والا نوجوان پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مردہ گاڑی کو اور کبھی دواخانے کے سینے پر پھیلے ہوئے بھانت بھانت کے چہروں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی مووی فلم کا آخری شارٹ دیکھ رہا ہو۔ وہ بظاہر مجمع سے الگ ہوتے ہوئے بھی مجمع ہی کا ایک فرد لگ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اسے کیوں دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جب کہ وہ انسانی بھیڑیوں کے بیچ آنا نہیں چاہتا۔"

کیا بک رہے ہو۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے قہر آلود نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ نوجوان نے اس کی بات کی ذرا بھی پروانہ کی اور گلے میں لٹکے ہوئے کیمرے کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنے ادھورے جملے کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنا پوسٹ مارٹم کروالیا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ اس کا خاموش اور ٹھنڈا جسم اب مزید کسی جراحت کا متحمل نہیں ہوگا۔" مگر کسی نے بھی اس کے کہے ہوئے جملے پر دھیان نہیں دیا۔ دفعتاً اوپر کی منزل کے پہلے سرے پر سفید لباس میں ملبوس ایک مٹیالے رنگ کا چہرہ ابھرا۔

لوگ چیخ پڑے یہی ہے وہ ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے سب کے چہرے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

بھائیو آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں گو معذرت

کبھی کبھی شرافت کے آگے ڈھال بن جاتی ہے۔ روشنی اور تاریکی میں لیٹا ہوا آدمی جب مردہ گاڑی کے تختے پر لیٹ جاتا ہے تو اُسے شور پسند نہیں آتا۔ وہ ابدی خاموشی کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس کی زندگی کا ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں دھرتی کے افق سے طلوع ہونے والے اس سورج کے انتظار میں اگر آنکھیں بند کرلی جائیں تو یہ ہماری بڑی ٹریجڈی ہوگی۔

اس پروفیسر کے بچے کو یہاں سے ہٹاؤ۔

ہمیں ڈاکٹر چاہیے۔

اور ڈیڈ باڈی ـ؟

یہ تو ہمارا بنیادی مطالبہ ہے۔

مختلف آوازوں کے ہجوم میں۔ اب ڈاکٹر کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی اب ادھر ادھر کے لوگ بھی اس مجمع میں شامل ہوگئے تھے۔ انھیں حقیقی صورت حال کا کچھ پتہ نہ تھا۔ لیکن وہ بھی آوازیں آواز ملانے کی کوشش کر رہے تھے نیچے لان میں چند لوگ لیٹے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ اس دھرتی کے باشندہ نہ ہوں کوئی اور مخلوق ہو۔

لوگ زندگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اتنے باولے ہو چکے ہیں اب صرف مردہ گاڑی ان کی توجہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور یہ ایک ڈیڈ باڈی کے لیے اتنا شور،،۔

نہیں یار ایسا لگتا ہے کہ یہ تمام زندانی ہیں جو یہ نہیں چاہتے کہ کوئی بھلا مانس اس دم گھٹتے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی ہوا میں سانس لے۔،،

مردہ گاڑی ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ ہمارے چہروں کی شناخت ہی آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اوپر کی منزل پر پھیلے ہوئے چہرے اس ڈاکٹر کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جس کا ایک پاؤں خود مردہ گاڑی میں پھنسا ہوا ہے مگر زندگی کے کٹھرے میں کھڑا ہو کر کوئی گواہ بننا بھی پسند نہیں کرتا۔،،

گواہ میں بنوں گا۔ لان میں لیٹا ہوا وہ نوجوان جس نے چپ کی چادر اوڑھ رکھی تھی

اونچی آواز میں کہا۔
بہت دیر میں سہی اس نے کام کی ایک بات تو کی۔"
مگر گواہ بننے میں ایک قباحت بھی تو ہے کیوں کہ گواہی شیطانی چہرے کی وہ لکیر ہے جو سچ کے بول میں شامل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی ہے۔ اگر مجھے منوں مٹی کے نیچے سے کوئی نکال کر یہ کہے کہ بھائی کیا تم میرے گواہ بنو گے تو میں سراسر انکار کر دوں گا اور کہوں گا کہ میری نیند برباد نہ کرو۔"
مگر گہری نیند سے بیدار ہونا بھی گیان ایک منزل ہے۔"
تم منزل کی بات کر رہے ہو میں اس زینے کی بات کر رہا ہوں جہاں مردہ گاڑی میں ایک شخص خاموش لیٹا ہوا ہے۔ مجھے تو وہ ڈاکٹر اچھالگ رہا ہے جس کے حلق سے بھانت بھانت کی بولیاں پھڑک رہی ہیں دیکھ رہے ہو اسکا سانس بھی پھول رہا ہے۔ مگر وہ چٹائی کی طرح جما ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس ٹیلے کے نیچے پھیلے ہوئے انسانوں کو اس نے دیکھ لیا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں ہی دیکھا ہو۔ یہ جملہ اس نوجوان نے کہا۔ جو زندگی کے زنداں کا آخری گواہ تھا۔ یا گواہی کا طوق ڈالنے کے لیے تیار تھا۔
میں ضرور گواہی دوں گا۔ اس نے ایک بار پھر اس طرح کہا جیسے وہ اپنی بات منوانا چاہتا ہو۔ ہم تمہاری آزادی میں مخل ہونا نہیں چاہتے تینوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔
مگر اس کے بعد تم ہم سے بچھڑ جاؤ گے؟"
میں پھر بھی تمہیں تلاش کر لوں گا۔
کیسے اور کس طرح؟ ہم تو کبھی ایک جگہ جم کر نہیں رہتے یہ تو تم بھی جانتے ہو۔"
زندگی کے آخری سرے پہ پاؤں رکھنے سے پہلے تم میں سے ایک آدمی بھی مجھے مل جائے تو میں سمجھ لوں گا کہ میری ملاقات تم سب سے ہو چکی ہے۔"
لیکن تم اپنے آپ ہی سے کب ملو گے۔ تم تو زنداں میں پھڑ پھڑانے والی زندگی کے ایک ادنیٰ گواہ ہو۔ ان چاروں آدمیوں میں سے ایک نے قدرے تحقیر آمیز انداز میں کہا وہ جیسے اس جملہ کو پی گیا۔ تمہیں وہ کنواں یاد ہے جہاں ہم چاروں نے ایک ساتھ چھلانگ لگائی تھی مگر پھر بھی

بچ گئے ۔ تم ایک کنویں کی بات کر رہے ہو میرے ذہن میں ہزاروں کنویں ہیں جہاں ہم نے ـــــ لیکن بات جب بچھڑنے ہی کی آگئی ہے تو ایک کنویں اور ہزار کنویں سے کوئی فرق نہیں پڑتا موت ایک اٹل حقیقت ہے زندگی کی جھوٹی گواہی ہی دراصل زندگی کی سب سے بڑی تحقیر ہے مگر تحقیر کے اس زہر کو تم چکھنا ہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں روکنے سے رہے۔ ہاں میں ہاں ملانا ہی انسان کی سب سے بڑی تحقیر ہے اب تم لوگ میری نظروں سے گر چکے ہو ۔ نوجوان نے اپنے ساتھیوں کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے حتمی انداز میں کہا ـــ

اپنی آواز میں کوئی اور سُر داخل ہو جائے تو سُر کی پہچان ناممکن بن جاتی ہے میں سمجھتا ہوں یہ نوجوان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے ۔ میں بھی شاید تم میں باقی نہ رہوں ۔ اس حلقے سے دو آدمیوں کا اس طرح نکل جانا انھیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ۔ اکائی میں طاقت ہے ایک آواز ابھری مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

پھر ایک موہوم سی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر گئی ـــ

اب میں تنہا رہ گیا ہوں یکہ و تنہا دور دور تک کوئی نہیں ۔ مگر دواخانے کی سیڑھیوں پر برآمدے پر ابھی تک وہی اژدحام ہے ۔ لوگ چلا رہے ہیں

نعش واپس کرو ۔ نعش واپس کرو ـــ ورنہ ہم دواخانہ کو آگ لگا دیں گے ۔ ہم ہسپتال کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے ۔ برآمدے میں ڈاکٹر ابھی تک کھڑا ہے اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ اس بنیادی مطالبہ کی تہہ تک پہنچ چکا ہے دوسرے ہی لمحہ اس کے ہونٹ اس طرح ہل رہے جیسے کوئی بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہو ۔ ڈاکٹر نے اطمینان کے لہجے میں کہا ۔ تم لوگ مردہ گاڑی سے نعش لے جا سکتے ہو ـــ

سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے ۔ انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نعش کے ساتھ انھیں ایک بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو ـــ

اب لوگوں کے قدم مردہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے ـــ

ٹھہرو بھائیو میں ایک بات اور تم سے کہنا چاہتا ہوں ۔ جس نعش کو تم مردہ گاڑی سے کھینچ لے جانا چاہتے ہو وہ مرا نہیں زندہ ہے ۔ "

ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سب چپ چاپ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ پانچ منٹ — دس منٹ — پندرہ منٹ — مردہ گاڑی کے اطراف اب کوئی نہیں تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ دواخانے کی سیڑھیاں پھلانگ رہے تھے۔ یکبارگی اُس لانبے بالوں والے نوجوان نے مردہ گاڑی کے قریب پہنچکر آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر اسے مجھے دے دو۔"

ایک زہریلی کہانی

اُس نے ابھی گھر کی دہلیز پہ قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی بیوی نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔۔ آج مُنا پھر گھر سے غائب ہو گیا ہے۔

اُسے یقین تھا کہ اس خبر کو سننے کے بعد اس کا شوہر اُسے کافی ڈانٹ پلائے گا کم از کم الٹے پاؤں ہی گھر سے اُسے ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے گا۔ مگر خلاف توقع وہ بڑے اطمینان سے گھر میں داخل ہوا۔ منھ ہاتھ دھونے کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور اپنی بیوی سے چائے کی ایک پیالی کی فرمائش کی۔ اس دوران اس کی بیوی نے جو کچھ کہا۔ وہ اسے محض سنتا رہا۔

اپنے شوہر کو اطمینان سے چائے پیتا ہوا دیکھ کر اُسے حیرانی ہوی۔ یہ حیرانی اسوقت اور بڑھ گئی جب اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر چائے پینے کے بعد اخبار بینی میں مصروف ہو گیا ہے۔ اُسے ایک ثانیہ کے لیے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ آدمی اس کا شوہر بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خبر کو سننے کے بعد اس نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا ہو۔ یا وہ یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ منا ادھر ادھر بھٹک کر کسی طرح گھر آجائے گا۔ وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبی اپنے آپ کو ایک ایسی بے بس عورت سمجھ رہی تھی جس کا آخری سہارا بھی ٹوٹ چکا ہو۔

اچانک کسی نے اُس کے گھر پہ دستک دی۔

”دو باہر کوئی آواز دے رہا ہے۔“ اس کی بیوی نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ جو اخبار پڑھنے میں کچھ اتنا منہمک تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی آواز بھی اب پرائی سی لگ رہی

تھی ۔

"ہو سکتا ہے کوئی مُنے کو لے آیا ہو ۔ یا خود مُنے نے گھر پہ دستک دی ہو ۔"

"اپنے گھر پہ خود مُنا دستک دے کیا کہہ رہی ہو ۔ مُنا اگر ہوتا تو دروازے ہی میں سے چیخ اٹھتا ۔" دروازہ کھولیئے ۔"

اس نے اطمینان سے اٹھ کر دروازہ کھولا ۔

" ارے الطاف تم ۔ ؟ اس نے خوشی سے بوکھلاتے ہوئے کہا ۔

" کب آئے ۔ "

" آج ہی ۔ "

" اندر آجاؤ یار ۔ "

اس کی بیوی نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا ۔ وہ اس کم بخت کو بھی آج ہی آنا تھا ۔ اب پھر چائے کا دور چلے گا ۔ اور ہوا بھی وہی ۔ اس نے چائے کے لیے ہانک لگائی اس کی بیوی نے چائے کی کیتلی کو بڑی بیزاری سے چولہے پہ رکھا ۔ اور وہیں سوچتی کھڑی ہو گئی ۔

چائے کی پیالیوں کی آواز سن کر اس کے شوہر نے اندر باورچی خانے میں آکر کہا ۔ رات کے کھانے پہ میں اُسے روک رہا ہوں ۔ دو ایک ڈھنگ کے سالن تیار کر لینا ۔

اس کی بیوی نے زہر آلود نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا ۔ مگر وہ کچھ کہے بغیر چائے کی کشتی ہاتھ میں تھامے ڈرائینگ روم میں آکر اپنے ساتھی سے گپیں ہانکنے لگا ۔

بڑی عمدہ چائے بنائی ہے بھابی نے ۔ اُس کا ساتھی کہہ رہا تھا ۔

" شاید نشانہ غلط لگ گیا ۔ وہ نہ ایک آنچ کی کسر ہمیشہ باقی رہتی ہے ۔ ایسا لگتا ہے کینٹین کی گاڑی اور بدمزہ چائے پیتے پیتے تمہارے منہ کا مزہ بدل گیا ہے

وہ یہ سب باتیں سن رہی تھی ۔ اس کا سارا دھیان مُنے ہی کی طرف تھا ۔ وہ سوچ رہی تھی اس کا شوہر کتنا بے حس ہے ۔ اپنے ساتھی کو رات کے کھانے کی دعوت دے رہا ہے ۔ جب کہ مُنا ـــــــ

وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

" میں نے ابھی ابھی کسی کے رونے کی آواز سنی۔ بھابی تو ٹھیک ہے نا۔"

اس کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

" بالکل ٹھیک ہے — "

" اور منا —— ؟"

" ہٹاؤ یار منے کے ذکر کو۔ بات چیت کے لیے کوئی اور موضوع نہیں ہے تمہارے پاس۔

اسے امید نہیں تھی کہ اس کا ساتھی بے اعتنائی کی اس سطح پر اتر آئے گا۔

اب اس کی باتوں میں وہ گرمی نہ تھی۔ پھر بھی وہ ایسے تیسے باتیں کیے جا رہا تھا لیکن اس کا سارا دھیان بٹا ہوا تھا۔

بے حس آدمی مرتا بھی تو نہیں —" اندر سے ایک غصیلی آواز ابھری۔

وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ دگرگوں ہے۔ وہ اپنے ایک قریبی یار سے کچھ چھپا رہا ہے۔ یہ آواز بھابی کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے۔ مگر وہ تو اس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔

آخر یہ کس قماش کا آدمی ہے۔ نہ اُسے اپنی بیوی سے پیار ہے اور نہ بچے سے۔

وہ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں۔ آج اس نے بیوی سے لڑائی کی ہو۔ یا بچے کو کافی پیٹا ہو۔

تمہیں آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا ہوگا۔" وہ اپنے ساتھی سے اس طرح کہہ رہا تھا جیسے وہ کھائے بغیر چلا جائے گا تو وہ بھوکا رہ جائے گا۔

اس نے حامی بھر لی تو وہ خوش ہو گیا۔

مگر بھابی کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔"

عورت تکلیف اٹھانے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہے۔"

یہ جواب بھی اُس کے لیے کچھ غیر متوقع تھا۔

" کیا یہ ممکن نہیں کہ بھابی بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔ ؟

" تمہاری بھابی نے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ وہ کھانے پہ نہیں آئے گی۔

اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ فرحت و طمانیت اٹھ چکی ہے جو کبھی اس نے اس گھر میں دیکھی تھی۔

دفعتاً اندر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

" شاید کھانا تیار ہو گیا ہو۔ یہ کھانے کی تیاری کا ہی الارم ہو سکتا ہے۔

وہ اندر چلا گیا۔

کھانا تو میں نے تیار کر دیا ہے۔ مگر منے کو بھی ضرور بلوا لینا۔ پتہ نہیں وہ کہاں بھوکا مر رہا ہو گا۔" یہ اس کی بیوی کی آواز تھی۔

جب وہ کھانے کی کشتی لے کر اندر آیا تو وہ کچھ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔

ابھی اس نے ٹیبل پر کھانا چنا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے پھر ایک بار آواز ٹکرائی۔

" بے حس آدمی مرتا بھی تو نہیں "

کیا تم بتا سکتے ہو وہ بے حس آدمی کون ہے جو مرتا بھی نہیں۔ کہیں وہ میں تو نہیں ہوں۔

مگر بھابی ....!!"

ہاں جب سے منا مرا ہے وہ اسی طرح باتیں کرتی ہے۔!

استری

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے ہی کو دوستی کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں۔ وہ آخری زینے تک پہنچ بھی پاتے ہیں یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔

دستگیر ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ فراخ ماتھا، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں سانولا سلونا رنگ۔ آنکھوں پر چڑھا ہوا کالا سیاہ چشمہ۔ وہ اس وضع قطع سے کوئی اور ہی ملک کے باشندے لگتے۔ سارے محلے کو لوگ انہیں دستگیر چچا کہتے تھے جب بوڑھے لوگوں نے بھی انھیں چچا کہنا شروع کر دیا تو انہوں نے اپنی داڑھی بڑھا

اُن کا ایک چھوٹا سا کاروبار تھا۔ وہ الیکٹریکل سامان کے واحد تاجر تھے جنھیں محلے کا ہر چھوٹا بڑا آدمی جانتا تھا۔

مجھے استری خریدنی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح بات ٹلتی جارہی تھی۔

ایک دن راستے میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ سلام کے لیے ہاتھ تو ان کا پہلے ہی اٹھ چکا تھا اب صرف مسکراہٹ بکھیرنا باقی رہ گیا تھا۔

"کوئی خاص بات ضرور ہے جو تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔" ؟

"راستے میں اگر اچانک یوں مڈبھیڑ ہو جائے تو کیا اسے ملنا کہیں گے۔"

"یہ تو اپنی سوچ اور سمجھ کی بات ہے۔ تاہم پھر بھی۔

بات یہ ہے کہ مجھے ایک استری خریدنی ہے وہ دو ڈھائی سو روپے تک تم نے استری کو اتنا سستا سمجھ لیا ہے۔ اور اس کی قیمت بھی لگا دی۔

خیر اگلے نکڑ پہ میری دوکان ہے وہ تمہیں وہاں مل جائے گی۔

جب اگلے نکڑ پر پہنچ کر انہوں نے اپنی دکان کھولی وہاں میں نے دیکھا بھانت بھانت کے چھوٹے موٹے سامان کا ایک ڈھیر تھا۔ اسی ڈھیر میں مجھے استری بھی نظر آئی۔

"دیکھو بھئی یہ رہی اپنی دکان۔ اور یہ رہی تمہاری استری۔"

میں نے الٹ پلٹ کر استری دیکھی۔ وہ مجھے بیک نظر پسند آگئی۔

سوچ رہا تھا مول تول کروں تو بات بن بھی سکتی ہے اور بگڑ بھی سکتی ہے۔

اس لیے میں نے قیمت اُن ہی پر چھوڑ دی۔

"لے لیجئے۔ آپ سے کیا مول تول۔"

"پھر بھی۔"

کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھتے ہو یار پہلے یہ بتاؤ کیا تم نے سارنگ پور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

ایسا تو نہیں مگر بمبئی کی مہانگری میں ٹامک ٹوئیے ضرور مار رہا ہوں۔

اشرف تم نے سارنگ پور چھوڑ کر بڑی غلطی کی ایک تو خاصی بھلی نوکری جاتی رہی۔ دوسرے وہاں قدم قدم پر ایکس پلائی ٹیشن کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ ایکس پلائی ٹیشن کہاں نہیں ہے۔ ہر جگہ ہے۔"

کم از کم تم اپنی ماں کی خاطر بمبئی چھوڑ کر سارنگ پور آجاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔

"ماں کی خاطر——؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ میرے جانے کے بعد ہی اچانک چل بسیں۔ اب مجھے پُرسہ نہ دو۔ مجھے ہمدردی جتانے والوں سے ایک گھن سی آتی ہے۔ تم میرے ایک اچھے دوست ہو۔ یقین ہے تم میری اس بات کا بُرا نہیں مانوگے جنید تمہیں یاد ہے میرا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ آج کل وہ دبئی میں ہے۔ اس کمینے نے ہمیں یک لخت بھلا دیا۔

میں نے اُسے ماں کی علالت کی اطلاع دی تو پتہ ہے اس نے کیا کہا۔

"بیماری بوڑھوں کا مقدر ہے۔"

پھر جب میں نے ماں کی موت کا اُسے ٹیلیگرام بھیجا تو اس نے دو سطر ہی میں مجھے

دیا۔

: موت برحق ہے۔ ویسے میں نے یہاں فاتحہ خوانی کا انتظام کروادیا ہے۔ براہ کرم
محبت کا پیمانہ نہ بنائیے۔ میں ہمیشہ یہاں مصروف رہتا ہوں۔"

اس کے بعد نہ میں نے اسے خط لکھا اور نہ اس نے۔ اب میں نے اُس کمینے کو
ہی بھلا دیا ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے سن کر کیا کرو گے۔ سوچ رہا ہوں ریڈی
منٹس کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لوں۔ بھنڈی بازار میں ایک جگہ بھی دیکھ لی ہے
ٹ پاتھ تو ہے ہی۔ اس ذلیل نے اگر چاہا ہوتا تو میں یہاں یوں دھکے نہ کھاتا۔ خیر
کارساز ہے۔ کچھ نہ کچھ تو سبیل نکل ہی آئے گی۔ اب سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔ کیا
ں ایکسپورٹ اور امپورٹ والا چکر ــــــ"

جب بھیر پھٹی تو پتہ چلا کہ بھنڈی بازار میں جو بم دھماکے ہوئے وہ دو مخصوص میاں
ں کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے اپنی ماؤں بہنوں کا بدلہ چکایا تھا۔

ہر حال جتنے منہ اتنی باتیں۔

گر صدیق بھائی کو کیوں گولی ماردی گئی۔ اُسی گولی سے وہ شنکر کو بھی مار سکتے تھے
شمن آدمی تھا۔

شنکر کو گولی مارنے کا مطلب تم سمجھتے ہو۔؟

ں سمجھتا ہوں۔

ب بڑا فرقہ وارانہ فساد

ا تم یہی چاہتے ہو۔؟

ن فساد چاہتا ہے۔ عام لوگ تو صرف امن چاہتے ہیں۔

شنکر کو گولی نہ مارو۔

ا کا مطلب ہے کہ وہ بلاضرورت گولیاں چلاتا رہے اور ہم لوگ تماشہ دیکھتے

ضرورت پڑنے پر چوڑیاں بھی پہن لیں۔

صدیق بھائی کی میت میں وہاں نہیں چلو گے۔"

"نہیں وہاں کرفیو ہے۔ وہاں جانے کی اجازت ان ہی لوگوں کو مل سکتی ہے جو اُن کے قریبی عزیز ہوں۔ پھر یہ جھوٹی گواہی کون دے گا کہ ہم ان کے قریبی عزیز ہیں۔ پھر یوں بھی میرا اُن سے کیا تعلق۔؟ روز کوئی نہ کوئی صدیق بھائی مرتا ہی ہے۔ گو گڑبڑ ختم ہو چکی ہے مگر نہ جانے یہ احساس مجھے کیوں ہو رہا ہے جیسے گڑبڑ پھر شروع ہو جائے گی

"بہتر یہی ہے کہ تم یہ استری یہیں رکھ دو۔ حالات ٹھیک ہونے پہ لے جانا۔

لیکن میں نے دستگیر صاحب کی بات نہیں مانی۔

پھر راستے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ کرفیو اب لگنے ہی والا ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں۔"

لوگ دھڑا دھڑ سہمے سہمے مختلف راستوں سے گزر رہے تھے۔ تنگ راستوں اور گلیوں سے گزرنے والوں کے چہرے عجیب تھے۔

جب میں نے گلی سے مڑ کر شاہراہ پہ پہنچا تو ایک پولیس والے نے مجھے آگے جانے سے روک دیا۔ میں نے جب اس سے احتجاج کیا تو اس نے کرخت آواز میں پوچھا یہ ہاتھ میں کیا ہے؟

"استری۔۔۔ جو ابھی ابھی میں نے دو سو روپے میں خریدی ہے۔"

ظاہر ہے استری میں وائر بھی ہوں گے۔

ہاں ایک دو تو رہتے ہی ہیں۔

وائر موٹے ہیں یا پتلے۔؟

دونوں۔

پھر تو معاملہ اور بھی سنگین ہے۔ تمہیں تھانے چلنا ہوگا۔

کس جرم میں۔؟

"یہ وہیں پتہ چلے گا۔"

چھٹکارہ کا کوئی راستہ۔

ایک ہی۔ تم یہ استری میرے حق میں چھوڑ دو۔ یہ استری میں نے دستگیر بھائی
پاس دیکھی تھی۔

کیا تم دستگیر بھائی کو جانتے ہو۔؟

ہاں دستگیر بھائی کو بھی اور گرجا شنکر کو بھی۔

یہ گرجا شنکر اچانک کہاں سے آدھمکا۔۔ تم اُسے کیوں گرفتار نہیں کرتے۔

وہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔ اس لیے ہر بار بڑی صفائی سے بچ نکلا
ہے۔ تم بھی وہی تیکنیک استعمال کر سکتے ہو۔

میں نے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس
دس کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر یوں ہٹا لیا جیسے وہ نوٹ نہ ہوں کوئی
خطرناک بچھو ہوں۔

مجھے پیسے نہیں استری چاہیئے۔

مگر یہ استری ہی کیوں؟ تم کوئی دوسری استری بھی تو لے سکتے ہو۔

لے تو سکتا ہوں۔ مگر۔ اس پر وہ لکھا نہ ہوگا۔

اس پر تو کچھ بھی لکھا نہیں ہے۔

غور سے دیکھو ہے۔ باریک حروف میں اوم۔ سیدھی جانب

میں نے دوبارہ استری کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کہیں بھی اوم کے شبد نہیں تھے۔

عجیب بات ہے تم لوگ اپنے خدا کو تو دیکھ لیتے ہو مگر تمہیں دوسروں کا بھگوان
دکھائی نہیں دیتا۔ شاید آج کے جھگڑے کی یہی وجہ ہو۔

میں نے مزید کچھ سوچے بغیر اُسے استری دے دی۔

اس نے مجھے کیا دیا یہ نہ پوچھیئے! اور کل کا اخبار ضرور دیکھئے کیا پتہ یہ استری کل کونسا
روپ دھار لے۔۔۔!!

گریباں گیر

برسوں بعد میں نے اُسے شہر کے ایک معمولی ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ سوچا کہ دو گھڑی اسے روک کر بات کر لوں اور پوچھوں ارے یاران بارہ برسوں میں تم نے کہاں کہاں کی خاک چھانی ۔ شادی بھی کی یا ابھی تک لنڈورے ہی رہے ۔ اگر شادی کی تو آبادی میں کس حد تک اضافہ کیا۔ ضروری اور غیر ضروری سب ہی باتیں ۔لیکن جذبے میں کوئی ایسی شدت نہ تھی کہ اس سے کم از کم اس کی خیریت ہی پوچھ بیٹھتا ۔ یوں بھی سڑک کی دھکم پیل سے طبیعت اوب سی گئی تھی جس بس سے اسے گھر لوٹنا تھا، اس کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی ۔ اس لیے اس نے آٹو رکشا کو ترجیح دی ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھر پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا تھا ، اس نے دہلیز پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی ۔ اتنے دنوں بعد آپ آئے ہیں تو بغیر کھانا کھائے میں آپ کو جانے نہ دوں گی۔ ایک آدھ گھنٹہ مزید آپ انتظار کر لیں تو وہ آ ہی جائیں گے ۔ لیجئے وہ آ گئے ۔

تسلیمات ۔ جیتے رہو ۔ اور خوش رہو ۔

آپ نے اپنے آنے کی کوئی خبر نہیں دی ورنہ اسٹیشن ضرور آتا ۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ خط لکھنا مجھے کتنا فضول سا فعل لگتا ہے ۔ شاید اسی سبب میرے احباب مجھ سے ہمیشہ شاکی رہے ۔ اور ایک ایک کر کے جدا بھی ہو گئے ۔ اچھا آصف میاں چھوڑو ان باتوں کو ۔ تمہاری صحت تو ٹھیک ٹھاک ہے نا ۔

ٹھیک ہی سمجھ لیجئے۔

تمہارے اس جملہ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بیماری سے تم نے ابھی تک چھٹکارہ حاصل نہیں کیا۔ مجھے دیکھو قریب قریب ساٹھ کے پیٹے میں پہنچ چکا ہوں۔ کیا مجال کہ کوئی بیماری میرے قریب آئے۔"

اس کے خسر نے اپنی صحت کے بارے میں ابھی ابھی جو بات کہی تھی وہ کچھ غلط نہ تھی لیکن پتہ نہیں اُسے یہ کیوں احساس ہو رہا تھا جیسے باتوں ہی باتوں میں انہوں نے اس کی صحت کی تضحیک کر دی ہو۔ تندرستی ہزار نعمت سہی لیکن بڑے میاں کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ نوجوانوں کی توہین کرے۔ نہیں نہیں یہ محض اس کی بدگمانی ہے وہ تو ایک بڑے شریف آدمی ہیں۔

اسی دوران چائے کی دو پیالیاں لیے اس کی بیوی نے قریب آکر کہا۔ لیجئے آپ بہت تھکے ماندے لگ رہے ہیں۔ گرم چائے پی لیجئے۔ اس سے تھکن دور ہو جائے گی۔

جب اس کے ابا نے تیزی سے چائے پی لی تو اس نے کہا۔ کیا ابا جی ایک اور کپ لا دوں۔ میں بیک وقت دو سے زیادہ کپ چائے نہیں پیتا۔ اچھا اب اجازت دو بیٹا۔ لالہ رام بھی میرے ساتھ ہی لوٹیں گے۔

ان کے ہاں کارج ہے۔"

چلئے سفر اچھا گزرے گا۔ ہم سفر جو اچھا ٹھہرا۔

پھر خدا حافظ کی آواز دور تک گونجتی رہی۔

جب وہ چلے گئے تو اس کی بیوی نے کہا۔ پتہ نہیں ابا جی آپ کی صحت کے بارے ، اتنے مشکوک کیوں ہو گئے۔ حالانکہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ ارے ہاں میں یہ بتانا ہی بھول گئی کہ آج حسن دوپہر میں آیا تھا۔ حالت اتنی بری بھی نہ تھی تاہم وہ تمہیں نہ پاکر مایوس سا لگ رہا تھا۔

مگر حسن کو تم کیسے جانتی ہو۔

جاننے کی بھی خوب رہی۔ اس نے جو نام بتایا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا۔ پتہ نہیں

اس سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔"

رشتہ تو بڑا نازک ہے۔ وہ میرا دوست ہے بلکہ کبھی تھا۔ وہ آج ہی دکھائی دیا۔ لیکن ..... یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اس کی اس خاموشی کو اس کی بیوی نے شاید بھانپ لیا۔ کم از کم اس سے مل لیا ہوتا

اس سے ملنا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی اپنے آپ سے ملے۔ اور میں اپنے آپ سے مل کر رسوا ہونا نہیں چاہتا۔"

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

سمجھ کر بھی کیا کرو گی۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بس تم یہ بات دھیان میں رکھو، جب بھی وہ یہاں آئے اُس سے کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔"

اس سے اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔"

مگر مجھے غریبی سے نفرت ہے۔"

نفرت کا یہ حق کس نے آپ کو دیا۔ وہ آپ سے کچھ مانگنے تو نہیں آیا تھا۔ کیا عجیب کہ وہ کسی اور کام سے آیا ہو۔"

وہ پھر ایک دن ضرور آئے گا۔ میں اس کا سامنا کرنے کا شاید اہل نہیں ہوں۔۔۔ میں نے اب تک جو کچھ بھی پونجی جمع کی ہے۔ وہ ہمارے لیے ہے اُس کے لیے نہیں۔ قبل اس کے وہ کچھ اور کہتا۔ گھر کی دہلیز پر وہ مسکراتا کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنز کی کاٹ تھی جیسے اس نے ہماری سب باتیں سن لی ہوں۔

جب گھر کی دہلیز پہ قدم رکھ ہی چکے ہو تو اندر ہی آ جاؤ۔"

وہ ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے سر دست کل کا اخبار چاہیئے۔

آج کا کیوں نہیں۔"

کیوں کہ میری زندگی کا کل آج سے میل نہیں کھاتا۔"

وہ لگتا ہے کچھ پریشان سے ہو۔"

"نہیں ۔ میں دکھی ضرور ہوں۔ لیکن پریشان نہیں ۔
" بات ہیر پھیر کر وہیں پہنچتی ہے ۔ جس سے تم گریزاں ہو ۔"
میں نے کل ہی [EN DOS COPY] کروائی ہے ۔ بڑا خراب Test ہوتا ہے
یہ ۔ اللہ کا کرم ہے کہ کوئی گروتھ { Growth } نہیں ہے ۔ لیکن مرض سی گریڈ
تک پہنچ چکا ہے ۔ علاج کرانے کی سکت نہیں ہے ۔ لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی خیراتی
اسپتال میں اڈمٹ ہو جاؤں ۔ تمہارا کیا مشورہ ہے ؟"
میں نے آج تک کسی کو کوئی مشورہ نہیں دیا ۔ دراصل کسی بھلے مانس نے کبھی مجھ سے
مشورہ مانگنے کی زحمت نہیں کی ۔"
تو گویا تم اب اتنے گئے گزرے ہو گئے ہو ۔
گئے گزرے تو تم ہو ۔ میں نہیں ۔ اس کا ثبوت تمہارا یہ چہرہ ہے خیر یہ بتاؤ برسوں
بعد اچانک تمہیں میری یاد کیسے آگئی ۔"
"وہ اس طرح کہ تم میرے مقروض ہو ۔ چاہتا ہوں کہ تم سے کچھ لے کر ہی اٹھوں ۔"
میں اور تمہارا مقروض ... ؟ کیا پاگل ہو گئے ہو ۔"
اس کومنٹ پر بجائے وہ شرمندہ ہونے کے واقعی کسی پاگل کی طرح قہقہہ لگاتا رہا ۔
جی چاہ رہا تھا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں ۔ لیکن اب وہ بید کی طرح کانپ رہا تھا ۔
تم تو بے طرح کانپ رہے ہو ۔ تھوڑی دیر سکون سے بیٹھو ۔ چائے پیو اور چلتے بنو ۔
کہاں جاؤں ۔ کوئی منزل کوئی ٹھکانہ ۔ کوئی شیلٹر ۔ میرا تو کوئی گھر نہیں ہے
جہاں پاؤں پھیلائے جب جی چاہا سو جاؤں ۔"
تو پھر مسلسل سڑک پر چلتے رہو ۔ نیند جب غلبہ پالے گی تو تم کہیں نا کہیں سر کے بل
گر جاؤ گے ۔ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور حربہ نہیں ۔
کم از کم اس بہانے دواخانہ پہنچا دیئے جاؤ گے ۔ تمہارے السر کا علاج شاید وہیں ہو
جائے یہاں تمہیں چائے کا علاوہ کچھ نہ ملے گا ۔"
"سر دست چائے ہی سہی ۔"

اُسے حیرانی ہوئی کہ وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اب چائے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ یہ سودا اس کے لیے مہنگا نہ تھا اس لیے اس نے بیوی کو آواز دے کر دو کپ چائے کی فرمائش کی۔

اس کی بیوی چائے کی دو پیالیاں تھامے اب سامنے کھڑی تھی ۔

بھابی آپ کا بھی کوئی جواب نہیں ۔ مگر میں چائے نہیں پیوں گا ۔ کہاں دو ہزار روپے کہاں یہ حقیر سی چائے ۔"

کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس ۔؟"

کل ثبوت ہی کے ساتھ آؤں گا ۔ یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا ۔

حسن نے جو کچھ کہا ۔ کیا وہ سچ ہے ؟"

"کیا اس کے ساتھ تم بھی پاگل ہو گئی ہو ۔ وہ جھوٹا ہے ایکدم جھوٹا ۔"

"مگر اس نے جو کل آنے کی دھمکی دی ہے ۔ اس کا کیا کرو گے ۔"

"میرے پاس اس کا بھی علاج ہے ۔ تم دیکھ لینا وہ کل نہیں آئے گا ۔"

"کل نہ سہی کچھ دن بعد بھی تو آسکتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ آفس ہی میں آدھمکے ۔

"تم اطمینان رکھو وہ آفس بھی نہیں آئے گا ۔ اب تم جھٹ پٹ میرے لیے چائے بناؤ سر پھٹا جا رہا ہے ۔

ابھی تو آپ نے پی ہے ۔"

میں نے ؟"

ہاں آپ نے ۔ یہ پیالی گواہ ہے ۔"

تم بھی ثبوت اور گواہی کی باتیں کرنے لگیں ۔ خیر اخبار ہی لا دو ۔ صبح میں نے صرف سرخیاں ہی دیکھی تھیں ۔"

"کیا متن کا زہر پی سکو گے ۔ ؟"

"کیا بک رہی ہو ۔ ؟"

لگتا ہے تم نے وہ نظم نہیں پڑھی ۔"

" کونسی نظم ۔"
" وہی جس کا کوئی عنوان نہ تھا ۔"
سرخیاں اخبار کی پڑھ لو
آج
اتنا ہی کافی ہے
کون متن کا زہر پیئے گا
کس کو اتنی فرصت ہے
یہ تو روز کا رونا ٹھہرا
ارے یہ دروازے کی زنجیر کون پیٹ رہا ہے ۔ کہیں وہ کھٹیچر آدمی پھر نہ آدھمکا ہو ۔"
اس نے تو کل آنے کی دھمکی دی ہے ۔"
کل اور آج دونوں اس کے لیے برابر ہیں ۔ مگر یہ کوئی اور خبیث ہے ۔
اس نے باہر آکر دیکھا ۔ دور دور تک کوئی نہ تھا ۔
دوسرے دن آفس سے لوٹتے ہوئے جب اس نے پہلا قدم دہلیز پہ رکھا تو سب سے پہلا سوال اس نے یہی کیا ۔ کیا وہ خبیث آیا تھا ۔؟
نہیں ۔۔۔"
میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ اب وہ یہاں نہیں آئے گا ۔ کسی کھڈیا خیراتی اسپتال میں پڑا سسک رہا ہوگا ۔ چھوٹے لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے ۔
تیسرے دن بھی اس نے یہی سوال کیا ۔

--- . ---

کیا وہ آج آیا تھا ۔؟"
نہیں ۔۔۔"
کیا وہ آج ۔۔۔ ؟
نہیں ۔ نہیں نہیں ۔۔۔

سر پٹک گیا نہیں کہتے کہتے ۔"

"کیا تم جانتی ہو وہ آنے والا کون تھا ۔ ؟"

"ہاں جانتی ہوں ۔"

"کیسے ـــــ ؟"

"جس طرح تم جانتے ہو ۔ !!"

گریہ

جنازے میں سبھی لوگ شریک تھے۔ مگر وہ گھر میں دروازہ بند کیے سوتا رہا۔ سوتا کیا رہا۔ بس یوں سمجھ لیجئے جاگنے اور سونے کے عذاب میں جھلستا رہا۔

اس کے ساتھی نے تیسری بار آکر اس سے کہا۔ جنازہ اب اٹھنے ہی والا ہے وہاں لوگ باگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلو چل کر اپنے یار کا آخری دیدار کر لو۔،،

جنازہ تو اسی سڑک سے گزرے گا اور میں اس ماتمی جلوس میں شریک ہو جاؤں گا۔،، اس نے عجیب انداز سے کہا۔

،، کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے؟ قبرستان جانے کے لیے اور راستے بھی تو ہیں۔،، یہی بات تم وہاں آکر کیوں نہیں کہتے کہ یہ سڑک جنازہ جانے کے لیے موزوں ہے۔،،

،، تم نے مجھ سے سوال کیا میں نے جواب دے دیا۔ تم چاہو تو میرے خیالات ان تک پہنچا دو۔،، ٹھیک ہے۔،، اس کے ہونٹوں پر نفرت کی ایک بدصورت لکیر ابھری۔ اور وہ پہلو بچاتا ہوا آگے نکل گیا۔

اب وہ دروازے کے باہر کھڑا اپنے ساتھی کو گلی میں غائب ہونے تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ان دو جانے پہچانے آدمیوں کو دیکھا جو کندھوں پر شال ڈالے تیز تیز راستہ طے کر رہے تھے۔

اس نے سوچا۔ شاید یہ لوگ بھی وہیں جا رہے ہوں۔ لیکن خلاف توقع وہ تھوڑی دور جانے کے بعد پلٹ کر اسی راستے پر آگئے جہاں سے وہ تھوڑی دیر پہلے گزرے تھے۔

،، کیا آپ نے ادھر سے کسی جنازے کو گزرتے دیکھا ہے۔؟،،

"ابھی تک تو نہیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔
"حیرت ہے۔؟" دوسرے آدمی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
"کیا ضروری ہے کہ وہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے؟"
"کون سا جنازہ؟"
"وہی جنازہ جس کے لیے آپ دونوں ...."
"کیا آپ بھی ....؟"
"نہیں میرا مسئلہ بالکل الگ ہے۔ میرے انتظار کی نوعیت آپ سے مختلف ہے۔"
"گویا آپ کو جنازے کا انتظار نہیں ہے۔؟" دونوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔
"ہے بھی اور نہیں بھی ـــ اور اگر ہے تو اسی سڑک پر میری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"
"جنازے سے؟" ایک نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ اور دوسرے نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی مشتبہ آدمی ہو۔
کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے۔ اسے لگا جیسے چٹانوں میں دبا ہوا کوئی آدمی اس سے کچھ کہہ رہا ہو۔
"کیا آپ نے کسی جنازے کو اِدھر سے گزرتے دیکھا ہے؟"
"ابھی تک تو نہیں۔"
پھر اس نے گھر کے سامنے کھڑے کئی جنازوں کو گزرتے دیکھا۔
یہ سارے جنازے اجنبی تھے وہ لوگ بھی اجنبی تھے جو جنازوں کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ فضا میں بڑی گھٹن تھی۔ نہ دن کا ہی احساس ہوتا تھا نہ رات کا۔ کچھ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔
وہ سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھی نے تو صبح صرف ایک ہی جنازے کی اطلاع دی تھی اور یہ جنازوں کا نہ ختم ہونے والا ماتمی جلوس۔
"یہ کون لوگ ہیں جو موت کی سرحد کو پھلانگ گئے اور مر گئے۔ مگر وہ جنازہ؟"

کیا وہ اس سڑک سے نہیں گزرے گا۔ کوئی اور راستے پر چل پڑے گا۔ ان ناہموار راستوں پر جہاں وہ اپنے قدموں کے نشان ثبت کرنا نہیں چاہتا۔ ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے یہ سیدھی سڑک کیا بُری ہے جس کے سینے پر وہ صبح سے کھڑا ہے۔ ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار۔

اچانک اس نے دیکھا۔ دو معمر آدمی جن کے سر کے بال برف کی مانند سفید تھے جن کے کندھوں پر اجلی شالیں تھیں۔ ہاتھ میں عصا تھامے اس کے قریب آرہے ہیں۔ ارے یہ تو وہی لوگ ہیں جن سے وہ صبح مل چکا ہے۔ مگر یہ اتنی جلد بوڑھے کیسے ہو گئے لگتا ہے جیسے کسی تاریخی کھنڈر سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔ کہیں یہ اس کا واہمہ تو نہیں ہے۔ نہیں نہیں یہ ایک حقیقت ہے۔ وہی چہرے۔ وہی اجلی شالیں۔ وہی سوتی کپڑے۔ سب کچھ وہی۔ وہ ان چیزوں کو کیسے بھول سکتا ہے۔

کیا وہ صبح سے اپنے گھر کے دروازے کے باہر نہیں کھڑا ہے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ وقت چلتے چلتے اچانک تھم گیا ہو۔

مگر یہ کیا؟ اس کے گھر پر کس نے تالا چڑھا دیا۔ صبح تو دروازہ کھلا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اس کے سامنے سے گزر گئے اور وہ انھیں دیکھ نہ سکا۔

اسے یہ دیکھ کر مزید حیرانی ہوئی کہ اس کے گھر پر TOLET کی تختی لگی ہوئی ہے تو گویا وہ یہ مکان بھی چھوڑ چکا ہے۔ اس کے گھر والوں نے کہیں اور ڈیرا جما لیا ہے لیکن صبح سے شام ہونے تک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

اُسے یاد آیا کہ صبح اس کے ساتھی نے گھر آکر اس سے کہا تھا۔ کیا کہا تھا اس کے ساتھی نے؟

وہ اچانک اس واقعے کو بھول گیا۔ وہ جتنا ذہن پر بار ڈالتا تھا اتنا ہی اپنے ساتھی کے اُگلے ہوئے جملوں کے سرے کو نہ پاتا۔

وہ ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ اب اُسے یہ سڑک بڑی ویران سی لگ رہی تھی۔ ہر جگہ سے کٹی پھٹی۔ بیمار اور مضمحل۔

مگر وہ سڑک پر اس طرح کیوں کھڑا ہے۔ اس مٹی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔
کیا وہ بھی اسی طرح ....
ان ہی حالات میں ....
یوں ہی ـــــ
فضول ـــــ
اُسے کچھ سجھائی نہ دیا اور وہ بدستور سڑک سے چمٹا رہا۔ اس نے پلٹ کر پھر ایک بار اپنے گھر کو دیکھا۔ دیوار کے سینے میں دھنسی ہوئی "TOLET" کی سیاہ تختی اُسے سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یکبارگی اس نے اپنے قریب ان دو بوڑھوں کو آتے دیکھا۔ جن کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جن کے شانوں پر اجلے رنگ کی شالیں لپٹی ہوئی تھیں۔
"کیا تم نے کسی جنازے کو اس طرف سے گزرتے دیکھا ہے؟"
"ابھی تک تو نہیں۔"
"حیرت ہے۔" پہلے آدمی نے دوسرے آدمی سے مخاطب ہو کر کہا۔
"کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے۔"
"کون سا جنازہ؟"
اس بار بیک وقت تینوں ایک ساتھ بول اُٹھے اور ایک دوسرے کے گلے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔۔!!

ریت کے محل

وہ عجیب آدمی تھا۔

اس کے جسم کے سارے کل پُرزے مضحکہ خیز حد تک بگڑے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی اُبھری اُبھری سی آنکھیں باہر یوں نکل آئی تھیں، جیسے کسی نے اس کا گلا دبا کر چھوڑ دیا ہو۔ کدّو کی طرح لمبوترا سر، دبی دبی سی پیشانی، چپٹی سی ناک، ہونٹ بھی عجیب طرح کے نچلا ہونٹ جتنا باریک اور خوب صورت تھا اوپر کا ہونٹ اتنا ہی موٹا اور بھدا۔ عموماً نچلا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کی بہ نسبت کچھ موٹا سا ہوتا ہے لیکن اس کے یہاں بات ہی بر عکس تھی۔ پھر طرفہ یہ کہ اس کا قد بھی ناٹا سا تھا۔ ان تمام "خوبیوں" نے مل کر اسے اچھا خاصا کارٹون بنا دیا تھا۔ گویا وہ آدمی بنتے بنتے رہ گیا تھا ناٹے قد کا ہونے کے باعث لوگ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے وہ بھی خواہ نخواہ مسکرا دیتا۔

پہلے پہل جب لوگوں نے اس کے ناٹے قد پہ پھبتیاں کیں تو اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ان باتوں کا عادی سا ہو گیا تھا۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ ایک بے ہودہ انسان ہے۔

میں نے اسے پہلی بار کنگسوے کے ایک بک اسٹال پر کھڑا دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں "امپرنٹ" کا تازہ پرچہ تھا میں نے بک اسٹال پر چند پرچے اُلٹ پلٹ کیے۔ میری اس عادت سے سکندرآباد کا ہر دوکاندار واقف ہے لیکن اس کے ساتھ میں کبھی کبھار ایک آدھ پرچہ خرید بھی لیتا۔۔۔ ناٹے قد کے اُس بدشکل آدمی کے ہاتھ میں "امپرنٹ" کا تازہ پرچہ دیکھ کر میرے احساس کے آبگینے پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا۔ اور میں نے بھی نفرت سے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ آہستہ دوکان سے کھسک کر بس اسٹاپ کے

پاس آکھڑا ہوا۔ پھر بس آتے ہی وہ رینگتا ہوا بس میں سوار ہوگیا۔ میں نے دوسری بس پکڑی اور چمن پر اُتر گیا۔

چمن اس راستے کا نام ہے جو افضل گنج سے ہوتا ہوا چادر گھاٹ ریلیا رستے جا ملتا ہے۔

پھر عابد روڈ کے چوراہے پر میں نے اُسے رات کے کوئی دس بجے کسی شخص سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا اب اُس کے ہاتھ میں "امپرنٹ" کے علاوہ دو ایک پرچے بھی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کیا ایک ناٹے قد کا بدشکل انسان بھی ادب اور اخبار بینی کا اتنا ستھرا ستھرا ذوق رکھ سکتا ہے۔

پھر میں نے اسے چھ آٹھ ماہ تک کہیں بھی نہیں دیکھا۔ میں چمن میں رہ کر بھی پھولوں کی خوشبو سے محروم تھا۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ میرا ڈرائینگ روم، غسل خانہ سب ہی کچھ تھا۔ اور مجھے اس گندے فلیٹ سے نفرت سی ہونے لگی تھی اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ ایک صاف ستھرا مکان لیا جائے۔ پھر میں نے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

آج صبح آفس میں میرے ایک ساتھی نے کہا۔ حمایت نگر میں ایک مکان خالی ہوا ہے پٹرول پمپ کے قریب ہی۔ اور میں آفس سے لوٹتے ہوئے حمایت نگر کے بتائے ہوئے پتہ پر آکر ٹھہر گیا۔ پھر میں نے ایک آدمی سے خالی مکان کا پتہ پوچھا۔ اس نے کہا آپ کو غلط فہمی ہوی ہے یہاں پر کوئی مکان خالی نہیں ہے" پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا "ہاں اس طرف ایک مکان شاید کرائے پر اُٹھنے والا ہے"۔

میں نے اس شخص کا رسماً شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا ۔ دو منٹ بعد ہی " TO LET " کے بڑے حروف پر آکر میری نگاہیں جم گئیں ۔ میں نے زور سے پھاٹک کے دروازے کو ہاتھ سے مارا۔ پڑوس کے مکان کی کھڑکی کھلی، اور پھر بند ہوگئی۔ میں نے دو منٹ کے وقفے سے پھر پھاٹک کے قریب آکر دستک دی۔

آپ بے کھٹکے مکان کے اندر چلے جائیے"۔ ایک بہت ہی خوبصورت نسوانی آواز فضاء میں گونجی۔

"جی شکریہ" کہتا ہوا میں مکان کے اندر داخل ہوا۔ اندر جا کر سارا مکان دیکھا۔

مکان صاف ستھرا تھا۔ دو خوب صورت کشادہ کمرے، ڈرائنگ روم، غُسل خانہ سب ہی کچھ تھا جو ایک متوسط طبقے کے شائستہ آدمی کے لیے ضروری ہے۔

جب میں پھاٹک کے قریب آیا تو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ان محترمہ نے کہا۔ ”کیا آپ کو پسند آیا ہمارا مکان؟“

”جی ہاں پسند آیا۔“

”تو ذرا ٹھہریئے۔ میں انھیں ابھی جگا کر بھیجتی ہوں۔“ اُس نے نہایت نرمی سے کہا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ کنواری یا دوشیزہ نہیں بلکہ شادی شدہ عورت ہے۔ پھر ایک شخص آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ میں نے دیکھا یہ وہی شخص تھا جسے میں نے کنگسوے کے بُک اسٹال پر دیکھا تھا۔

میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ میں نے یونہی فضا خوشگوار کرنے کی خاطر کہا۔

”ہاں صاحب دیکھا ہوگا۔ کچھ ہماری شخصیت ہی ایسی ہے کہ لوگ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے طنز آمیز لہجے میں یوں کہا جیسے وہ اپنے خالق سے گلہ کر رہا ہو۔

”کیا کرایہ ہے اس مکان کا؟“

”پندرہ سو روپے۔ اگر آپ دو ماہ کا کرایہ پیشگی دے دیں تو آج ہی مکان آپ کی تحویل میں دے دوں گا۔“

دوسرے دن میں فلیٹ بدل چکا تھا۔ صبح جب صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر جاتا تو کھڑکی کا پٹ آہستہ سے کھلتا ہوا مجھے دکھائی دیتا اور میں نے بارہا اسے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔

آج صبح میں آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا کہ وہ آدھمکا۔

”آج میری سالگرہ ہے اس لیے آج رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیے۔“

میں کچھ تامل کے بعد اس کے اصرار کرنے پر راضی ہوگیا جب وہ چلا گیا تو میری زبان سے بے ساختہ نکلا کارٹون کا بچہ بڑا آیا سالگرہ منانے شام کو جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تو وہ مسکراتا ہوا باہر نکل آیا اور بڑے ہی خلوص سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔

”یہ میری بیوی ہے۔“ اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں نے چور نگاہوں سے اس کے خدوخال کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی حسین و جمیل لڑکی تھی۔

زیادہ سے زیادہ بتیس یا تینتیس سال کی ہوگی۔ لیکن اس کے خدوخال میں ایک بانکپن تھا۔ ایک کشش تھی۔ اس کی آواز میں کنواری لڑکی کا سا لوچ تھا۔

مجھے اس ناٹے قد کے بدشکل انسان کی آزاد خیالی پر حیرت اور خوشی ہوئی جس نے بغیر کسی بیجا شرم و حیا کے اپنی بیوی سے تعارف کرانے میں بھی ذرا جھجک محسوس نہیں کی۔ پھر کچھ دنوں بعد میں نے انھیں دعوت دی۔ چونکہ میں تنہا تھا اس لیے میں نے ڈنر کا سارا انتظام ہوٹل سے کروایا تھا جب وہ دونوں میرے گھر آئے تو میں نے خوشی سے ان دونوں کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رات دیر گئے تک وہ دونوں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کی بیوی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے اور اس کا شوہر ملک کا ایک مشہور کارٹونسٹ

وہ مجھ سے بہت جلد ہل مل گئے جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ کبھی میں ان کے ہاں جایا کرتا اور کبھی وہ میرے ہاں چلے آتے لیکن کبھی میں نے اُسے اپنی بیوی کو شام میں اکیلا چھوڑ جاتے نہیں دیکھا تھا اور وہ ہمیشہ اپنی بیوی کے ساتھ نکلا کرتا۔ لیکن ایک شام جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے جب مجھے آتے دیکھا تو بہت تپاک سے اور مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ آج پہلی بار میں اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے گھر گیا تھا۔

"رات میں نے دہی بڑے بنائے تھے" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے لیے لے آتی ہوں" وہ کرسی سے اٹھ کر باورچی خانے میں گئی اور ایک پیالے میں دہی بڑے لے آئی میں نے انھیں چکھا۔

"بہت لذیذ بناتی ہیں آپ" میں نے اس کی تعریف کی۔

"ہاں کچھ ان کا بھی یہی خیال ہے" وہ بولی

میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کچھ انٹرویو کے سے انداز میں پوچھا۔

"کیا لائٹ میوزک سے بھی آپ کو دلچسپی ہے؟"

"کیوں نہیں، بہت زیادہ ہے۔ انہیں بھی تو میوزک سے بہت زیادہ لگاؤ ہے"

مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ وہ ہر بات میں خواہ مخواہ اپنے شوہر کا حوالہ دیتی ہے۔

"اردو افسانے سے بھی آپ کو کچھ دلچسپی ہے؟" یہ میرا دوسرا سوال تھا۔

" منٹو میرا فیورٹ رائٹر ہے، میرا خیال ہے منٹو سے اچھا افسانہ نگار ہند و پاک نے پیدا نہیں کیا۔"

پھر میں نے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے پیالے میں رکھے ہوئے دہی بڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" سفید دہی میں یہ بڑے کتنے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر دہی کی جگہ انھیں کسی سالن میں ڈال دیا جائے تو کتنے بُرے معلوم ہوں گے۔"

میں نے دیکھا میرے اس سوال پر اس کا پھول سا کومل چہرہ کچھ اتر سا گیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اس نے ایک فراخ انگڑائی کے ساتھ بھرپور جماہی لی جیسے اب وہ سونا چاہتی ہو۔ مجھے احساس ہوا کہ میں زیادہ دیر بیٹھ گیا ہوں۔

"اچھا اب اجازت دیجیے۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔"

"جی نہیں مجھے تو آپ سے باتیں کرنے میں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔"

دیوار پر ٹنگی ہوئی بڑی گھڑی نے زور و شور کے ساتھ رات کے دس بجائے۔

" اوہ دس بج گئے وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

اور میں چاہ رہا تھا کہ اس کا شوہر ابھی نہ آئے تاکہ جی بھر کر میں اس سے باتیں کر سکوں، لیکن دوسرے ہی لمحے کسی کے قدموں کی دبی سی چاپ میرے پیچھے آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرا کاڈونسٹ دوست مسکراتا کھڑا تھا۔

کیا میں آسکتا ہوں۔ اس نے کہا۔

" آئیے تشریف لائیے۔" میں نے اس انداز میں کہا جیسے یہ میرا گھر تھا اور وہ میری طرح پڑوسی۔

آج رات آپ کو بہت دیر ہو گئی۔ اس کی بیوی نے تشویش کے انداز میں پوچھا۔

" ہوا یہ کہ "بھاشا" کے مدیر مدراس سے آگئے تھے وہ زبردستی مجھے اپنے گھر کھینچ لے گئے اور ہاں مجھے ان کے شدید اصرار پر کھانا، کھانا ہی پڑا۔ میں نے لاکھ کہا کہ بھئی میں اپنی بیوی کے بغیر کھانا کھا نہیں سکتا کیوں کہ وہ کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن انہوں نے نہیں مانا اور کہا اب تو کھا بھی لو۔ شریمتی جی کے ساتھ کل پھر آپ کی دعوت رہے گی۔

"تم نے کھالیا ۔۔۔ ؟" کارٹونسٹ نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"جی نہیں میں آپ کے بغیر کیسے کھا سکتی ہوں۔ میں نے آپ کے لیے آج دہی بڑے بنائے تھے۔ اور پھر تو بڑا ستم ہوا۔ اب کھانے کی گنجائش بھی تو نہیں۔ خیر کچھ لا ہی دو۔ ہم دونوں ایک دو بڑے چکھ ہی لیں گے۔" اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی میں نے ابھی کھایا ہے۔" میں نے اپنے کارٹونسٹ دوست سے معذرت چاہی۔

"اوہ! آپ نے کھالیا؟"

پھر اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ "اور کھائیے دہی بڑے ہی تو ہیں۔"

رات زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے میں مناسب یہی سمجھا کہ اب گھر چلنا چاہیئے۔ میں گھر آکر بستر پہ دراز ہو گیا۔ کسی کروٹ نیند نہ آئی۔ خیالات جاڑے کے آوارہ بادلوں کی طرح منتشر ہو رہے تھے۔ میرے دماغ پہ کارٹونسٹ کی بیوی چھائی ہوئی تھی۔ کتنی حسین وجمیل ہے وہ گلاب کے کول پھول کی طرح تازہ وشاداب۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کارٹونسٹ نے میرے سپنوں کی اپسرا کو مجھ سے چھین لیا ہو۔ ایک بدشکل آدمی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک پھول کی طرح نازک دوشیزہ کو اپنا شریکِ حیات بنائے۔ جانے کمبخت نے اس پہ کیا جادو ٹونے کیے ہیں جو وہ اُسی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ ورنہ میرے سامنے یہ پہلی مثال تھی۔

رات بھر میرے خوابوں میں اس کا حسین وجمیل چہرہ رقص کرتا رہا۔ صبح جب میں اٹھا تو میری آنکھیں بوجھل تھیں۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے آفس چلا گیا اور جب آفس سے لوٹا تو اپنے گھر جانے سے پہلے کارٹونسٹ کے گھر آواز دی۔ لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ کہیں میرے دوست نے بُرا تو نہیں مانا کیوں کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی سے بات چیت کی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرا شک رفع ہو گیا جب میں نے پھاٹک پہ پڑے ہوئے تالے کو دیکھا۔ شاید وہ دونوں مدراسی ایڈیٹر کے ہاں دعوت میں گئے ہوں۔

دوسرے دن صبح وہ میرے گھر آیا۔ وہ بہت عجلت میں تھا۔

آج میں "بھاشا" کے ایڈیٹر کے ساتھ ضروری کام سے مدراس جا رہا ہوں، چار دن میں لوٹ آؤں گا۔ تم مکان کا ذرا خیال رکھنا۔ آشا بے حد حساس ہے۔ تنہائی سے وہ بہت گھبراتی

ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے آنے تک آشا کا دل بہلاتے رہو گے۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتا ہوا چلا گیا
وہ چلا گیا لیکن اب میں سوچنے لگا۔ کتنا عجیب آدمی ہے۔
کوئی اپنی بیوی کو غیر مرد کے بھروسے اس طرح چھوڑ جاتا ہے۔ پھر وہ بھی ایک بیچلر کے رحم و کرم
پر ہو سکتا ہے۔ میری ہی نیت ڈانواں ڈول ہو جائے۔ آخر میں بھی تو ایک انسان ہی ہوں۔ یہ
اور بات ہے کہ میری رگوں میں شریفوں کا خون ہے۔
میں نے دبے پاؤں اس کے گھر میں قدم رکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ آخر اکیلے گھر میں کیا کر رہی
ہے۔ میں نے دیکھا وہ قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ آئینے میں میرے
عکس کو دیکھ کر اُس نے کہا " آجائیے "
پھر جب پلٹ کر اُس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل دھک سا ہو کر رہ گیا۔ وہ آج نیلے رنگ
کی ساری میں یوں نظر آ رہی تھی، جیسے بارش کے بعد دھنک نکل آئی ہو۔ وہ مسکرائی۔ اُس کے گالوں
پر حیا کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ پھر اُس نے کہا۔
" آج موسم کتنا سلونا ہے۔ ٹینک بنڈ چلئے بڑا مزا رہے گا۔"
لیکن مشکل یہ ہے کہ میں آپ کا ساتھ اس وقت نہ دے سکوں گا۔" میرے اس غیر متوقع جواب
پر اس کا چہرہ کچھ اتر سا گیا۔
" آخر کیوں نہ چلیں گے آپ ــــ ؟" اس نے حاکمانہ انداز میں پوچھا۔
" کون آپ کے ساتھ چل کر خواہ مخواہ لوگوں سے جھگڑا مول لے " وہ شرما سی گئی۔ اس کی
پیشانی پر غرور و مسرت کی ایک چمک پیدا ہوئی۔ چلئے بھی چھوڑیئے مذاق۔ خوب بنتے ہیں آپ !"
دیر گئے تک ہم ٹینک بنڈ پر بیٹھے مختلف باتیں کرتے رہے اور میں جانے کیا کیا سوچنے لگا۔ لیکن
جب لوٹتے ہوئے پھر اس نے اپنے شوہر کی محبت کے قصے چھیڑ دیئے تو مجھ پر سے خوش فہمی کا بھوت
اتر گیا۔

رات جب ہم گھر لوٹے تو گیارہ بج چکے تھے۔ میں آشا کو اُس کے گھر تک پہنچا آیا۔ جب میں نے
آشا کے کمرے کی لائٹ جلائی تو میرا کاٹونسٹ دوست خراٹے لیتا ہوا سو رہا تھا۔ میں اپنے دوست
کو دیکھ کر سہم سا گیا۔ جیسے میں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ اُس کا منہ چھوٹے بچوں کی طرح کھلا ہوا

تھا اور ہونٹوں کے کنارے تھوک بہہ بہہ کر تکیے پر جم گیا تھا۔

صبح جب میں دیر سے اٹھا تو میری آنکھیں رات کی یادوں کے خمار سے بوجھل تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری پلکوں میں گزشتہ رات کے جلتے جاگتے خواب کے ٹکڑے اٹک گئے ہوں۔ میں بڑی دیر تک آشا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور اس محویت میں مجھے آفس کا بھی خیال نہ رہا۔ چنانچہ میں آفس دیر سے پہنچا۔

تین دن تک آشا اور کارٹونسٹ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے دل میں گمان پرورش پا رہے تھے کہ شاید کارٹونسٹ نے میری اس حرکت کا برا مانا ہے اور شاید یہی خوف مجھے اس کے گھر تک پہنچنے میں مانع تھا۔

چوتھے دن شام کو کارٹونسٹ میرے گھر آیا۔ اور اس نے بڑی فراخ دلی سے گزشتہ دنوں کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا مجھے اس کے رویّے سے بڑی طمانیت ہوئی۔

"سناکہ اُس دن خوب باتیں رہیں" میں جواب دینے ہی کو تھا کہ اُس نے کہا۔ چلو ہمارے گھر آشا تمہیں یاد کر رہی ہے"

آشا کا نام سنتے ہی میرا دل جیسے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو گیا دوران گفتگو میں اس نے بتایا کہ اس کا مدراس جانے کا پروگرام کس طرح ٹھپ ہوا اور کس طرح ٹرین تک پہنچنے میں دیر ہوئی۔ غرض کہ کارٹونسٹ اپنی کہے جا رہا تھا اور مجھے آشا کو دیکھنے کے خیال ہی سے کچھ شعلے سے دل میں لپٹے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میں اور کارٹونسٹ جب گھر میں داخل ہوئے تو آشا نے فوراً کہا شکر ہے آپ کو ہماری یاد بھی آئی۔ ورنہ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ ہمیں بھول گئے ہیں"

"میں بھلا آپ کو کیسے بھلا سکتا" میرا گلا جذبات سے رُندھ سا گیا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس وقت کارٹونسٹ زہر لگ رہا تھا۔ میں خواہ نخواہ اس کے خلاف بھرا بیٹھا تھا اور وہ مسخرا بچھا جا رہا تھا۔

مجھے آشا اور کارٹونسٹ کے اصرار پر رات کے کھانے پر ٹھہرنا پڑا۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ ادب، آرٹ، سیاست غرض کہ ہر موضوع پر ہم لوگوں نے اظہار خیال کیا۔ فن تعمیر پر

بات چل نکلی تو اجنتہ، ایلورہ کی گپھاؤں سے ہوتی ہوئی یونان کے مجسموں تک جا پہنچی، تصویر کشی کا ذکر چھڑا تو لیونارڈو کے موقلم سے پکاسو تک۔ شاعری موضوع بحث بنی تو جاسر سے ایلیٹ اور الفرڈ نوائس تک تقریباً سب ہی شاعر ہماری بحث کی زد میں آتے رہے۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے قدم قدم پر یہ محسوس کیا کہ آشا میرے ساتھ ہے۔ اُس کے خیالات میرے ساتھ ہیں۔ اس کا شوہر مجھے کسی کہسار کے تن تنہا پودے کی طرح نظر آنے لگا۔

اِدھر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ آشا دن بدن میرے قریب آتی جارہی ہے میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال میرے ذہن میں کس طرح جڑ پکڑ گیا کہ آشا کو اپنے شوہر سے ضرور نفرت ہی ہونی چاہیئے۔ بھلا ایک ٹھنگنے آدمی سے بھی کوئی محبت کر سکتا ہے۔ آشا کے قرب سے میں اپنے شب و روز میں ایک ٹھنڈک ایک طراوٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ آشا مجھے ضرور چاہتی ہے۔ میرے خیالات کو پسند کرتی ہے اور ان میں اپنی محبت تلاش کرتی ہے

ایک دن ہماری گفتگو کا موضوع کارٹون کشی تھا۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ "میرا خیال ہے کہ جو مصوّر اپنے فن میں ناپختہ رہ جاتا ہے، وہ کارٹونسٹ بن جاتا ہے" اس پر آشا نے ہنسی کی جھانجھیں چھنکا دیں اور کارٹونسٹ خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ آشا جو اُس وقت پھول کاڑھ رہی تھی۔ چہرے سے بے حد شگفتہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس شگفتگی سے خوب خوب فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کے شوہر کو اپنے مذاق کا ہدف بنا کر اُس کا جی بہلانا چاہتا تھا بلکہ یوں کہیئے کہ اس پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک ایسے آدمی کے لیے نہیں بنائی گئی ہے جسے محفل میں مذاق کا جواب تک دینے کا سلیقہ نہیں۔

اس کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے گفتگو میں مذاق سے کہیں زیادہ ذاتیات کو جگہ دے دی۔ ہوا یوں کہ میری کرسی کے آگے ایک قدِ آدم آئینہ رکھا تھا جس کے برابر ہی لکھنے کی میز تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "آرٹسٹ جی! کہیں کارٹون بناتے ہوئے آئینہ نہ دیکھیئے ورنہ کارٹون شاہکار بن جائے گا" میرے اس جملہ پر آرٹسٹ جی تو ہنسنے لگے لیکن آشا نے خلاف توقع کوئی نوٹس نہیں لیا اور برابر سنجیدگی سے پھول کاڑھتی رہی۔ مجھے قدرے ناامیدی ہوئی۔ میں نے اپنے ترکش سے دوسرا تیر نکالا اور چلا دیا "قبلہ آرٹسٹ جی! میرا خیال تو یہی ہے کہ ایک بلند قامت آرٹسٹ

ہی اونچے درجے کی تخلیق کرسکتا ہے۔ یہی دیکھئے نا ......"

یہ کہہ کر جب میں نے داد طلب نگاہوں سے آشا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ اور اس کے ہاتھ سے سوئی گر چکی تھی۔

شال

"یار کیسے آدمی کو ہم نے کھو دیا ۔۔۔ اب ایسی ٹھکی ٹھکائی طرح دار گالیاں ہمیں کون دے گا۔" دوسرے ساتھی نے جو اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ کندھوں پر جھولتی ہوئی شال کو جسم پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ شال دس ہزار گالیاں دینے کے بعد اس نے مجھے تحفتاً دی تھی۔ جب تک یہ شال میرے جسم پر رہے گی وہ مجھے یاد آتا رہے گا۔"

"عجیب بات ہے اس نے مجھے کبھی گالی نہیں دی حالانکہ تمہاری طرح وہ بھی میرا یار تھا۔"

"یہی تو ٹریجڈی ہے تمہاری۔"

ویران قبرستان کی دم گھٹا دینے والی فضا سے نکل کر وہ اب ریستوراں میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنا غم غلط کر رہے تھے۔ کیوں کہ بار جا کر غم غلط کرنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ان کی سیٹ کے برابر ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بظاہر چپ چاپ بیٹھا تھا لیکن دراصل ان کی توجہ کا مرکز مرنے والے کے ان دونوں ساتھی تھے جو چائے کی پیالیوں میں ڈوبے ہیروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

"تمہیں یاد ہے اسی ٹیبل پر میری اس کی شدید لڑائی ہوئی تھی، کتنی گالیاں دی تھیں اس نے مجھے ۔۔۔ یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھ میرے گلے پر ۔۔۔"

"یار یہ وقت نہیں ہے ان باتوں کو دُھرانے کا۔ وہ اب ہم میں نہیں رہا۔ ایک دن ہم بھی نہیں رہیں گے۔"

"نہیں یار اسے سب کچھ کہنے دو۔ گلے میں پھنسی ہوئی باتیں اگر وہ نہیں اگلے گا تو مر جائے گا۔ کم از کم اسے کچھ دن اور زندہ رہنے دو۔ ہم تو سمندر میں پھیلی ہوئی وہ بادبانی کشتیاں

ہیں جو ہوا کے اشارے پہ چلتی ہیں۔ ہمارا کوئی ملاح نہیں ہے۔ اسے کہنے دو یار۔ اس کا گلا نہ گھونٹو ۔۔۔"

مگر وہ کچھ کہنے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتے ہوئے وہ کچھ عجیب سا الگ رہا تھا۔

"بھانڈ سالا ۔۔۔"

"سن رہے ہو بوڑھے نے ابھی کیا کہا۔"

"میں نے سن لیا ہے۔ اگر وہ آج ہماری محفل میں ہوتا تو اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا یا اس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہتا ۔۔۔ جیو میرے لال"

مگر وہ ابھی تک رو رہا تھا۔ بوڑھے کی جگہ اب خالی ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک کالا بھجنگ گھنگھریالے بالوں والا نیگرو بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ ٹیبل پہ چینی کی پلیٹ میں کاغذ کا ایک پرزہ رکھا ہوا تھا جس پہ PAID کی مہر ثبت تھی۔

"یہ بل ہم نے تو PAY نہیں کیا۔"

"کیا تم نے بل PAY کیا ۔۔۔؟"

"نہیں"

"اس پہ تو PAID لکھا ہوا ہے۔"

"کبھی کبھی اُدھار مانگی ہوئی زندگی کے چہرے پہ کوئی منچلا PAID لکھ دے تو ہمیں شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔ ندامت کا بار اٹھانے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔"

"مگر پھر بھی یہ جاننا ضروری ہے کہ بل کس نے ادا کیا ہے۔"

"بیرہ ۔۔۔"

"بیرے کو بلوانے کی ضرورت نہیں۔"

وہ تینوں ہوٹل سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ ان تینوں میں سے کسی نے کہا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم میں سے کوئی کہیں سے پچاس روپے اُدھار لائے ۔۔۔

اگر آج نہیں پی سکے تو سمجھو مر گئے ۔۔۔

"دو پچاس روپے — ؟ اتنی بڑی رقم اس وقت بھلا کون دے گا۔ سراج کو میٹرو میں دیکھ لیں گے ورنہ شراب کی جگہ اپنا خون ہی پی لیں گے۔"

"سراج نے تو کئی دن سے صورت نہیں دکھائی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی موت سے کہیں زیادہ ہمارے ذہن پر شراب کی دھن سوار ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ اندرونی طور پر ہم سب موت کے بدصورت پرندے سے خائف ہیں نہ جانے کب وہ پر پھیلائے اور اپنی نوکیلی چونچ ہمارے جسم میں داخل کر دے۔"

وہ اب خاموش چل رہے تھے۔ کچھ گھبرائے گھبرائے سے۔ یہ خاموشی بے معنی نہیں تھی۔ اس خاموشی میں کئی معنی پنہاں تھے۔

سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی اونچی کشادہ عمارتوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بونے محسوس کر رہے تھے۔

"لو میٹرو آگیا —"

"اتنی جلد —— ؟" بیک وقت دونوں ساتھیوں نے حیرانی سے کہا۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اب میٹرو کے سینے پر کھڑے ہیں۔ لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر چند نوجوان بیٹھے گلاسوں میں شراب انڈیل رہے تھے جو بِک چکے تھے وہ خلاؤں میں بکھری ہوئی یادوں کو یکجا کرنے کی سعی لاحاصل میں گرفتار تھے۔ بعض لوگ اس انتظار میں تھے کہ ویٹر آئے اور کاگ اڑے۔

جب بھانت بھانت کے عجیب و غریب چہرے ہر طرف پھیلے ہوئے ہوں اور روشنی مدھم ہو تو بسا اوقات اپنی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

اب اس ہجوم میں سراج کو پانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی آسمان کی پنہائیوں میں اڑنے والے پرندے کو اچک کر پکڑ لے۔

خوشی اور حقارت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پلیٹوں میں رکھے ہوئے کاغذ کے پرزوں پر ٹِپ کی شکل میں رکھے ہوئے پیسوں کے تھوک کو بیرے چاٹ رہے تھے۔

مگر ابھی تک وہ پیاسے تھے۔

کیبن کے دروازے بند تھے۔ صرف لوگوں کے پاؤں میں دھنسے ہوئے جوتے نظر

آرہے تھے۔ یا ڈھیلے ڈھالے پتلونوں میں چھپی ہوئی دبلی پتلی، موٹی بھدی ٹانگیں اب صرف ایک ہی کیبن باقی رہ گیا ہے اگر وہ وہاں بھی نہ ملے تو ـــ

کوئی دوسرا بابا ـــ

تیسرا ـــ

چوتھا ـ !!

"ارے میرے پاؤں تلے کوئی چیز دب کر رہ گئی ہے۔"

پہلے ساتھی نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں ـــ فرش ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔"

"وہ دیکھو کیبن کے نچلے حصے سے اس کی شال دکھائی دے رہی ہے۔ سلیٹی رنگ والی شال"

"کیا کہہ رہے ہو؟ سلیٹی شال تو میرے جسم سے چمٹی ہوئی ہے۔ کیا تم لوگ اندھے ہو گئے ہو۔"

وہ کچھ جواب دیے بغیر اسے تنہا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "وہ جو ہمارے ساتھ تھا وہ کہاں گیا۔"

"کون تھا ساتھ ہمارے۔؟"

دیکھو کیبن کے نچلے حصے میں اس کی شال بدستور ڈول رہی ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔"

کم و بیش میں بھی ......"

ایک انجانے خوف اور ڈر میں لپٹے ہوئے وہ کسی طرح کیبن میں داخل ہو گئے۔

"کچھ پیو گے ـــ"

زندگی اور موت کے بطن سے جنم لینے والی اس آواز کو جیسے انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔

"جب پینا نہیں تو جھک مارنے کے لیے بار آئے ہو۔" جواب نہ ملنے پر وہ غرایا۔

لیکن وہ چپ تھے۔ بالکل گم سم۔

حرامزادو ـــ آج اچانک گونگے کیوں ہو گئے ہو۔ کچھ تو بولو۔ مجھے تو تمہیں وہ

حادثہ سناتا ہے جو اتنا عجیب اور انوکھا ہے کہ میں اس تعلق سے سوچتے ہوئے تقریباً ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں ۔ مگر میں نے اس شکست و ریخت میں بھی اپنی ذات کے چند پرزے بچا لیے ہیں ۔ اور یہ پرزے بھی اب میرے نہیں رہے ۔ کل میں اخبار پڑھ رہا تھا اچانک ایک خبر پر میری نظریں جم گئیں ۔۔ ایک نامعلوم نوجوان سلیٹی رنگ کی گرم شال میں لپٹا ہوا سڑک عبور کر رہا تھا کہ اچانک اس نے سینے میں سخت تکلیف کی شکایت کی اور طبی امداد ملنے سے پہلے ہی مر گیا ۔ نعش مردہ خانے میں شناخت کے لیے رکھی گئی ہے ۔

میں کل سے اب تک مارا مارا پھر رہا ہوں تا کہ خود اپنی نعش کی شناخت کر سکوں ۔

میں اپنے وجود کی کرچیوں کو جمع کرتے کرتے اب لہولہان ہو چکا ہوں ۔

حرمزادو ـــــ کیا یہاں میری نعش چبانے آئے ہو ۔ میں تمہیں ابھی ......

یہ کہہ کر وہ دیوانگی کے عالم میں ان میں سے ایک پر جھپٹ پڑا ۔ اب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کا گلا دبا رہا تھا ۔

مجھے چھوڑ دو ـــــ مجھے چھوڑ دو ....

آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی گئی مگر وہ بدستور اس کا گلا دباتا رہا ۔ یہاں تک کہ وہ فرش پر ڈھیر ہو کر رہ گیا ۔

اب اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی ۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چند منٹ کا مہمان ہو ۔

وہ تھوڑی دیر ٹکٹکی لگا کر مرنے والے کو دیکھتا رہا ۔

پھر اچانک پلٹ کر اس نے دوسرے سے پوچھا ۔

او یار میری شال کہاں گم ہو گئی ۔ !!

بات صرف اتنی تھی کہ ایک بہت بڑے شاعر کی قبر کتبے سے محروم تھی۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور جب کتبے کی تجویز منظور ہو گئی تو کنوینر نے خالی خالی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھا۔ لوگ آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے۔

"کتبے کے لیے پیسہ چاہیے"۔

"بالکل چاہیئے۔ صاحب! بھلا بغیر پیسے کے کہیں کتبہ بھی تیار ہوا ہے؟"

"لیکن سوال صلیب بدوش ہونے کا ہے"۔

"بھلے مانس سیدھی زبان میں کیوں بات نہیں کرتے"

"ہاں بھائی ہماری زبان جب تک ادق رہے گی، بیل منڈھے نہیں چڑھے گی"۔

"بیل چڑھانے کے لیے پانی بھی تو چاہیئے"

"پانی کی ہمارے دیس میں کیا کمی ہے"

"آپ کا مطلب سیلاب سے ہے نا؟"

"ساتھیو جس مقصد کے لیے ہم جمع ہوئے ہیں، وہ پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا"

"یقیناً پورا ہو گا جی —— آپ کام تو شروع کروا دیں ——"

"لیکن سوال تو پیسوں کا ہے۔ افسوس کہ ایک ایسے دور میں جب کہ قبریں مٹ رہی ہیں"

"تو مٹا کریں"

"کیا بک رہے ہو؟"

"تمہیں یہاں کس نے بلوایا ہے۔؟"

"میں بہ نفسِ نفیس آنے کا عادی ہوں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں، اتنے برس کے بعد اچانک کتبے کا خیال کیوں آیا، پھر ایسی صورت میں جب کہ شاعر نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر کسی قسم کا کتبہ نہ ہو۔"

"شاعر مرتا کب ہے وہ تو مر کر جیتا ہے۔"

"کتبہ یقینی لگے گا؟"

"بالکل بجا۔"

"شاعر کی قبر کہاں ہے؟"

"قبرستان میں۔"

"عجیب بہروپیوں سے سابقہ پڑا ہے۔"

"قبر تو ظاہر ہے قبرستان ہی میں ہوگی ـــ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ قبر کس محلہ کے قبرستان میں واقع ہے!"

"بھئی یہ سوال بھی کچھ اہم نہیں۔"

"حیف کیا زمانہ آگیا کہ لوگ مشہور شاعر کے مدفن سے واقف نہیں۔"

"اسی لیے تو کتبے کی ضرورت ہے۔"

"اتنی دیر سے بحث ہو رہی ہے کیا شام کی چائے نہیں ملے گی۔؟"

"ضرور ملے گی صاحب۔"

"کیا تم نے چاند دیکھا ہے۔؟"

"ہاں بھئی دیکھا ہے ـــ بالکل الٹا ہو کر رہ گیا ہے۔"

"یہ شگون اچھا نہیں ہے۔"

"ذرا یہاں سے کھسک جاؤ ـــ یہ بڑے وہمی لوگ ہیں۔"

"کیا روزی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہوئی تو تھی۔"

"تو پھر کیا کہا اس نے؟"

"کورٹ شپ کو ابھی لانگ ہونا چاہیئے "

" ساتھیو! کتبے کی بات تو ادھوری رہ گئی "

" وہ بات جو طے ہو چکی ہے وہ ادھوری کس طرح رہ سکتی ہے ؟"

" توکل سے کام شروع کروا دیں ۔ بالکل ۔ یقیناً ۔"

" ذرا ٹھہریئے قبر کی شناخت کون کرے گا ۔ ؟"

" ہاں بھئی! یہ کتبے سے زیادہ اہم سوال ہے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غیر ادیب کی قبر پہ ہمارے شاعر کا کتبہ چڑھا دیا جائے ۔"

ساتھیو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا "

ہماری محفل میں علامہ برکت بھی تو ہیں۔ وہ ان کے جنم جنم کے ساتھی تھے "

" یار خالی پیٹ میں چائے زہر کی طرح چبھ رہی ہے ۔"

" گھر سے کھا کر کیوں نہیں آئے "

" جی نہیں چاہا "

" اب یہاں سے کہاں چلیں گے ۔ ؟"

" فردوس "

" وہاں کیا کام ہے ؟"

" مجھے ایک عزیز سے ملنا ہے "۔

" کیا میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں ؟"

" اگر اس طرح ایک کے پیچھے ایک سب ہی باہر نکل جائیں یہاں کون رہے گا ۔ ؟"

" تم اس کی فکر نہ کرو ۔ یہاں کافی لوگ ہیں ۔ ہر آدمی ہماری طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے ؟"

" آدمی بہرحال آدمی ہوتا ہے ۔"

" چلو اچھا ہوا ہم انسان ہونے سے بال بال بچ گئے "۔

" یہ لوگ تو صرف چائے ہی پر ٹرخا رہے ہیں ۔ "

" کیا کھانا بھی تناول فرمانے کا ارادہ ہے ۔ ؟"

"وہ برآمدے میں کون صاحب کھڑے ہیں ۔۔ ؟"

"کوئی بھی ہو یار! میری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ۔۔۔"

"تمہیں چائے کی پڑی ہے۔ مجھے گھر جلد لوٹنا ہے۔ محلے کی فضا خراب ہے"

"موسم بھی تو خراب ہے"

"ساتھیو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا خدا کا شکر ہے کہ یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو گیا"

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا۔ برسوں بعد شاعر کی قبر پھولوں سے لدی ہوئی تھی، اطراف میں لوہے کی رنگین جالی لگوا دی گئی تھی اور سنگ مرمر کا صاف و شفاف کتبہ سراونچا کیے کھڑا تھا ۔ لیکن سب سے عجیب بات یہ تھی کہ شاعر مرحوم کے پہلو میں دفنائے ہوئے ایک آدمی کی قبر سے کتبہ غائب تھا ۔۔!

تیسرا بٹ ٹہ

"یہ بچہ کس کا ہے؟ یہ بچہ کس کا ہے؟" ہجوم کو چیرتی ہوئی ایک بھاری بھرکم آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے پلٹ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کا چہرہ ردِ عمل سے بالکل خالی تھا۔

ہجوم جس تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی تیزی سے گھٹتا بھی جا رہا تھا۔

ایک زمانے کے بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکلا تھا تھوڑی سی خوشیاں سمیٹنے کے لیے۔ ان دونوں نے ایک چھوٹا موٹا سا تفریحی پروگرام بنایا تھا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا، کھانا اور پھر پکچر دیکھنا۔

آدمی جب راستہ طے کرتا ہے تو کبھی کبھار اس کے پاؤں تلے کنکر آجاتے ہیں جنھیں ٹھوکر لگا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

اس کی بیوی نے کنکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اطمینان کرتی ہوئی وہ قدموں کی ایک ایک چاپ کو گننے لگی لیکن وہ اندر ہی اندر جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔

"کھانا کہاں اور کس ہوٹل میں کھائیں گے؟" اس کے شوہر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"کسی بھی ہوٹل میں"

بیوی کے اس نپے تلے جواب کے بعد اسے آگے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اطمینان سے سامنے والے رستوران میں داخل ہوا۔

ہوٹل میں کئی کیبن تھے اور بیشتر کیبن خالی خالی سے تھے کیبن سے پردہ اٹھا کر اس نے رومال سے کرسیوں کی گرد صاف کی اور اپنی بیوی کے سامنے مینو رکھ کر ایک سگریٹ سلگایا۔

"آپ نے ہوٹل کا انتخاب کیا بھی تو ..."

"تم ہی نے تو کہا تھا نا کہ کسی بھی ریستوران میں کھانا کھا لیں گے۔"
"کہا تو تھا مگر گھر سے نکلتے وقت ہمارے ذہن میں کسی اچھے ریستوران کا خاکہ تھا۔"
"انسان کی سوچ لامحدود ہے اور خاکے تو ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔"
"آپ مجھے بور کر رہے ہیں۔ یہ ہوٹل ہے؟ دیکھئے مینو پہ بھی چائے کے دھبے ہیں؟"
"ہماری طرح کسی دل جلے نے مینو دیکھنے کے بعد اپنی حیثیت کو پہچان کر شاید اس پر چائے انڈیل دی ہو۔"

بات آگے بڑھنے سے پہلے دیو ہیکل ویٹر نے کیبن میں داخل ہو کر ایک دیوار سی کھڑی کر دی۔ اس کی بیوی نے پھر ایک بار اپنے شوہر کی طرف دیکھا لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے وہ ویٹر سے خائف ہو گیا ہو۔

اسے تھوڑی دیر پہلے کا ایک واقعہ بے طرح ستا رہا تھا۔ ایک نامعلوم سی خلش ایک بے نام سی چبھن اُسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ ہوا یوں تھا کہ اس کا ایک دوست جس سے اس نے مدتوں پہلے کچھ روپے اُدھار لیے تھے جسے وہ عمداً بھولے ہوئے تھا۔ آج اتفاقاً اس کے ہاں آ گیا تھا۔ اس کا دوست لمبی چوڑی باتیں کیے جا رہا تھا۔ لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آگے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور اس ایک بات کو اُگلنے کے لیے اُسے سینکڑوں غیر ضروری باتیں کرنی پڑ رہی ہیں۔ جب باتوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اُس نے بجائے رخصت ہونے کے خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا۔

اُس کے دوست سے کہیں زیادہ آج وہ اضطراری کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا دوست کچھ کہے مگر وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں اس کی زبان پر کا تالا کس طرح کھل گیا۔ "مجھے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے۔ کل پرسوں لوٹا دوں گا۔"

وہ اطمینان سے اپنے ساتھی کا محاسبہ کرنے لگا۔ وہ اپنے دوست کا مقروض ہے، شاید اس لیے وہ اس بہانے پیسے لینا چاہتا ہے۔ وہ صاف صاف بھی تو کہہ سکتا تھا کہ یار تم میرے مقروض ہو۔ میں نے عین آڑے وقت میں کچھ روپے دیے تھے، اب تم میرے پیسے لوٹا دو۔ تم بھول گئے ہو۔ لیکن میں نے اسے نہیں بھلایا ہے۔

"پیسے لینے والا اکثر بھول جاتا ہے لیکن جس آدمی کی جیب سے پیسے نکلتے ہیں وہ اس منظر کو بھی نہیں بھول سکتا۔"

وہ اس طرح کی ساری باتیں اپنے دوست کی زبان سے سننا چاہتا تھا، مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اُس نے اپنا مدعا دوبارہ دُہرایا بھی نہ تھا۔

"یار کچھ عجیب کڑکی ہے۔ یقین جانو میرے ہاں صرف سوا روپیہ ہے۔ کل پرسوں تک تو تمہارے ہاں بھی کچھ روپے آ ہی جائیں گے۔ مناسب سمجھو تو ایک روپیہ ہی رکھ لو۔"

شاید اُسے یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اس لیے اس بدقت تمام کہا "ایک روپیہ لے کر میں کیا کروں گا۔ رہنے دو شاید یہ پیسے تمہارے کسی کام آجائیں۔"

"کام تو میرے بھی نہیں آئیں گے۔"

"تو پھر وہ روپیہ ہی لا دو۔"

دفعتاً کھڑکی سے ایک سایہ ابھرا اور وہ اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ بھی نہیں تھا اور وہ گھگھیاتے ہوئے اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔

اس روپے کو شاید جیب سے میری بیوی نے نکال لیا ہے۔ نہیں نہیں میں بھول رہا ہوں۔ گھر آتے ہی وہ روپیہ میں نے اُسے دے دیا تھا شاید خرچ میں آگیا ہو۔

"عجیب کرب، بے چارگی، انتشار سے گزر رہے ہیں ہم لوگ اور گنوار پن کا یہ عالم ہے کہ ہم جھوٹ بھی سلیقے سے نہیں کہہ سکتے۔ یہ کہہ کر وہ جیسے اس کے منہ پر طمانچہ مار کر چلا گیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ، چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔"

جیسے وہ خواب سے چونکا۔ "مگر وہ کھانا"

"کھانا وانا میں نے نہیں منگوایا۔"

"کیوں؟"

بس یونہی"

کوئی دوسرا ہوٹل دیکھیں"

"دوسرا بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"اب رہنے بھی دیجئے۔"

ہوٹل کے سارے کیبن لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ صحن میں چند لوگ یا تو چائے کی چسکیاں لے رہے تھے یا سنبوسے کھا رہے تھے۔ کچھ لوگ آج کے مسائل پر فاضلانہ انداز میں باتیں کیے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ چھڑ گئی تو کیا ہوگا؟"

"صاف مر جائیں گے۔"

"تو کیا اب جی رہے ہیں؟"

"جی تو رہے ہیں اور ساتھ ساتھ سنبوسے بھی کھا رہے ہیں آئیے تو کچھ اور ہی ارادے سے"

"سب لوگ ہنسنے لگے۔"

اس کی بیوی نے اپنے شوہر کو کھویا کھویا سا دیکھ کر طنز بھرے انداز میں کہا۔ آپ کا سا ڈل آدمی میں نے شاید ہی دیکھا ہو، دیکھو! لوگ باتیں بھی کر رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں، اور آپ ہیں کہ بت بنے بیٹھے ہیں۔"

اُس نے اپنی بیوی کے اس طنز کا کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کھڑا ہوا اب وہ دونوں تیز تیز قدم ڈالتے، پروگرام کے مطابق سینما ہاؤس جا رہے تھے۔ شام کے ڈھلتے ہی بڑے بازار کی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نئے نئے موڈل کی موٹریں تیزی سے سڑک کے سینے پر دوڑ رہی تھیں اور لوگ باگ مختلف دوکانوں میں گھسے ہوئے شاپنگ کر رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو حسرت سے دوکانوں کے چمکتے ہوئے شیشوں میں اپنے عکس ہی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور بعض سجی سجائی دوکانوں کی مختلف چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ یہاں واقعی کچھ خریدنے کے خیال سے آئے ہوں۔

سینما ہاؤس ابھی کافی دور تھا اور ہر بس اسٹاپ پر ایک لمبا سا کیو لگا ہوا تھا۔ کیو کی اُلجھن سے بچنے کے لیے وہ پیدل ہی جا رہے تھے۔ وہ چاہتے تو ٹیکسی بھی لے سکتے تھے۔ لیکن پتہ نہیں ان دونوں کو پیدل چلنے میں کس قسم کی لذت کا احساس ہو رہا تھا۔

لیکن بڑی سڑک پار کرنے کے بعد اس کی بیوی کی چال میں تھکن پیدا ہو گئی تھی۔

"وسکیا ٹیکسی لے لیں"

"اتنی دور چلنے کے بعد اب آپ کو ٹیکسی کا خیال آیا۔ یہ بات تو آپ کو پہلے ہی کہنی چاہیئے تھی"

"میں اب تک یہی سمجھتا رہا کہ تم پیدل چلنے کے موڈ میں ہو"

"آپ کی شخصیت ہی کچھ عجیب سی ہے۔ وہ بات جو کسی کے ذہن میں نہیں آتی پتہ نہیں کس طرح آپ کے ذہن میں آجاتی ہے؟

"یہی تو میری انفرادیت ہے"

"خاک انفرادیت"

وہ اس کے اس جملے کو جیسے پی گیا

اب وہ دونوں پھر چپ چاپ۔ سڑک سے گزر رہے تھے۔ مجھے معاف کر دیجئے کبھی کبھی مجھ سے گستاخی ہو جاتی ہے اور آپ بھی چپ چاپ میری باتوں کو پی جاتے ہیں۔ آپ مجھے غلطی پر ٹوکتے بھی تو نہیں۔

اب وہ سینما کے احاطے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ پکچر جس کے ارادے سے وہ یہاں آئے تھے وہ کل ہی جا چکی تھی اور اس کی جگہ ایک دوسری نئی فلم کا بورڈ سینما کے گیٹ پر لٹکا ہوا تھا۔ پکچر غالباً ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی نے بکنگ ونڈو کے قریب پہنچ کر فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ خریدے۔

"یہ دو کے بجائے تم نے تین ٹکٹ کیوں خریدے" اس کے شوہر نے حیرانی سے پوچھا۔
یہ تیسرا ٹکٹ میں نے منّے کے لیے لیا ہے، جو کبھی ہمارے ساتھ پکچر دیکھا کرتا تھا۔ کم از کم یہ احساس تو رہے کہ وہ آج بھی ہماری ہر چھوٹی سی چھوٹی خوشی میں شامل ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں کی خلاؤں میں عجیب سی اُداسی تیر رہی تھی۔

دو گز زمین

صبح ہی صبح بستر سے اٹھ کر اس نے مندی مندی آنکھوں سے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ ڈراؤنے خواب کے ریزے اس کی آنکھوں کے حلقے پر ابھی تک نیزے کی طرح دھنسے ہوئے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ سامنے کھڑی ہوی چوبی الماری سے لگے اس پرانے شیشے پر گئی۔ جہاں ایک بھیانک سایہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید کبوتر کے پروں کا ایک گھونسلا لٹک رہا تھا۔ اور ہونٹوں سے ذرا اوپر کالی مونچھوں کا ایک گچھا۔ نہیں ــــ نہ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ گھر کی بیمار اور کمان کی طرح جھکی ہوی دیواریں جیسے کانپ کانپ گئیں۔ اور سامنے درخت کی جھولتی ہوی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑپھڑا کر آسمان کی پنہائیوں میں ڈوب گئے۔

اس کی بیوی وحشت کا لبادہ اوڑھے، حیرت سے اس طرح اسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کا شوہر نہیں کوئی اور آدمی ہو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے میں آیا اور آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہوا یکبارگی گھر سے نکل پڑا۔

اب وہ آدمی زمین کا یہ ٹکڑا تمہیں کسی قیمت پر نہیں دے گا۔ بیوی کی تھرتھراتی ہوی آواز بھی اب اسے بھاری پتھر کی طرح ضرب لگاتی ہوی محسوس ہوی اس کے قدم اور تیز ہو گئے ـــ تیس برس کی طویل مسافت ـــ ٹیڑھی میڑھی بے ڈھنگی سڑکیں ـــ بھاگ دوڑ چیخ و پکار گھٹن بے چارگی۔ ـــ

کیا تم سمجھتے ہو وہ آدمی زمین کا یہ ٹکڑا تمہیں دے دے گا۔ اب تو اس کی قیمت بھی آسمان

کو چھو رہی ہے ۔ » یہ اس کی بیوی کی آواز تھی جو اس کا مسلسل تعاقب کر رہی تھی ۔

اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ اب وہ یادوں کی عمیق کھائی میں اوندھے منہ گرا پڑا تھا ۔ سویرے کا ملگجا اجالا سڑک پر پھیلے ہوئے مکانوں کی چھتوں پر آہستہ آہستہ اتر رہا تھا ۔ اور اسے بہت دور جانا تھا ۔ میلوں دور شہر کی ساری دکانیں سوئی ہوئی تھیں ۔ اور ان کے منہ میں دھنسے ہوئے کالے بے ڈھنگے سے تالے ایک عجیب طرح کی ویرانی کا احساس دلا رہے تھے ۔ ٹیکسی اسٹانڈ پر موت کا سا سکوت تھا اور ڈرائیور حلقہ بنائے چپ چاپ کھڑے تھے ۔

ٹیکسی —— اس نے آواز دی ۔ اور ٹیکسی کی آواز کے ساتھ ہی سامنے کھڑے ہوئے ڈرائیوروں میں سے کسی منچلے نے کہا ۔ ٹیکسی بات نہیں کرتی اور ڈرائیور کہتا ہے کہ آج ہڑتال ہے

"اور وہ سکوٹر والے ۔ ؟"

"وہ بھی ہڑتال پر ہیں ۔"

"رکشا والے ——"

"وہ بھی ——"

اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ پیدل چلے ۔ اور وہ سڑک پر چلتا رہا ۔ چلتا رہا ۔ درمیان میں اسے دو ایک ٹیکسی کاریں سڑک پر دوڑتی ہوئی دکھائی دیں ۔ لیکن اس میں ڈرائیور بیٹھے ہوئے تھے ۔ ٹانگیں —— مکمل اور ادھوری —— مضبوط اور توانا —— لاٹھی چارج —— آنسو گیس —— گولی —— دنگا فساد —— آگ اور پھر پانی ۔ بچپن سے اس نے یہی سب کچھ دیکھا تھا ۔ راستہ چلتے چلتے وہ ایک عجیب حادثہ سے دوچار ہو گیا ۔ وہ جس آدمی سے زمین کے اس ٹکڑے کو خریدنے جا رہا تھا ۔ اس کا نام اس کے ذہن سے قطعاً محو ہو گیا تھا ۔ ذہن پر بار بار زور ڈالنے کے باوجود اسے اب اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا اس نے الف سے لے کر ی تک کی گردانیں کر ڈالیں لیکن اس کا نام کسی بھی حرف سے شروع ہوتا نظر نہ آتا تھا ۔

مگر اچانک وہ راستے ہی میں اسے نظر آ گیا ۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے جو اس کے آگے پیچھے اس طرح چل رہے تھے جیسے وہ اس کے باڈی گارڈ ہوں ——

اس کا جی چاہا کہ اسے پکارے ۔ مگر کس نام سے ۔ وہ کوفت اور غصے سے آپ ہی آپ بلبلا اٹھا ۔ لیکن اس آدمی نے چلتے چلتے اچانک پلٹ کر اسے دیکھ ہی لیا ۔ اور اس کے ساتھ والے دونوں آدمی بھی اس کے تتبع میں وہیں اس کے برابر ہی ٹھہر گئے ۔

"ارے تم ۔ صبح ہی صبح کدھر نکل گئے ۔"

"تمہارے ہی ہاں جا رہا تھا ۔

"کہو کوئی خاص بات ۔"

"وہ زمین ....

"وہ اب تمہیں نہیں ملے گی ۔"

آخر کیوں ۔ ؟"

تم نے بہت دیر کر دی ۔ اس کا وقت گزر چکا ۔

مگر تم نے تو وعدہ کیا تھا ۔"

"وعدہ ـــــ ؟ اگر ہر آدمی وعدہ جیسے بے معنی لفظ کا پاس رکھے تو اس بھاگتی ہوئی دنیا کا کوئی اور نام رکھنا ہوگا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو ۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا ۔ اس کے ساتھ والے دونوں آدمیوں نے جاتے جاتے اسے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں ۔ سُن لیا ہے نا جواب ۔

وہ اس کے اس ظالمانہ برتاؤ سے پگھل کر رہ گیا ۔ اس کا سر چکرا رہا تھا ۔ زمین ـــ کے ٹکڑے کا وہ لالچ آخر اس نے اسے دیا ہی کیوں تھا ۔ بدمعاش ـــ کمینہ ـــ سفلہ ـــ اب راستہ چلتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی متاع عزیز کو کہیں دور دفن کر آیا ہو ۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا ۔ سڑک سے لگے قبرستان سے اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ۔ اور آگے چل کر یہی آواز چند ملی جلی آوازوں میں تبدیل ہو گئی ۔

اسحاق ذرا کدال زور سے چلانا یار ۔ دیکھ نہیں رہا ہے لاش زمین پر کب سے ہمارے رحم و کرم پہ پڑی ہوئی ہے ۔ اسے جلدی زمین کے منہ میں ٹھونس دے ۔" نعش بھاری نہیں ہے ۔ یہ ٹکڑا ہی اس کے لیے کافی ہے ۔ اس نے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں

کو اپنی قمیض سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ کوئی قبرستان میں داخل ہو رہا ہے۔ کون ہو گا وہ —"

"کوئی بھی ہو گا سالا — اپنے کو اس سے کیا لینا دینا۔"

"مگر وہ تو اسی طرف آ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اخبار کا رپورٹر ہو۔"

"یہ نعش کس کی ہے۔ ؟"

"تمہیں اس سے کیا۔"

"کیا نام تھا مرنے والے کا۔"

نعش کا کوئی نام نہیں ہوتا نعش بے نام ہوتی ہے۔ نام زندگی ہی تک چلتا ہے جب سانس اکھڑ جاتی ہے تو سانس کے ساتھ ہی نام بھی دفن ہو جاتا ہے اور نعش لاوارث ہو جاتی ہے —"

"مگر نعش پہ تو کفن بھی لپٹا ہوا نہیں ہے۔ یہ نعش کی بے حرمتی ہے۔"

"ہم نے جتنی بھی آج تک نعشیں دفن کی ہیں — وہ بے کفن ہی تھیں۔"

بڑے موڈرن گورکن معلوم ہوتے ہو —" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

مگر یہ سب کچھ تو اوپر والے ہی حکم سے ہوتا ہے، ہم تو سب تابعدار ہیں۔"

وہ یکبارگی قبرستان سے نکل کر سڑک پہ آ گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ اس کے سامنے سے اب جو بھی لوگ گزر رہے تھے ان کے چہروں پر سفید پروں والے کبوتروں کے گھونسلے لٹکے ہوئے تھے اور ہونٹوں سے ذرا پرے کالی اور سیاہ مونچھوں کے کئی گچھے۔

اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اور درختوں کی جھولتی ہوئی شاخوں پہ بیٹھے ہوئے پرندے پھر ایک بار آسمان کی پہنائیوں میں ڈوب گئے۔

کنواں آدمی اور سمندر

میں نے دروازے کی کنڈی لگائی تالا گھمانے کی کوشش کی تو لگا جیسے تالے میں کوئی اچانک خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ میں نے جو چابی استعمال کی ہے وہ دراصل دوسرے تالے کی ساجھے دار ہے۔ اس کا اس تالے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے لوٹتے قدموں سے اندر جا کر دیکھا۔ چابی میز پہ دھری تھی۔ اس بار تالے میں چابی گھمائی تو ایک لمحہ بعد ہی تالے کا منھ بند ہو گیا۔ اور میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آ گیا۔

سڑک پہ کافی گہما گہمی تھی، گو ابھی شام ہونے میں دیر تھی لیکن بعض منچلے دکانداروں نے مرکیوری ٹیوب کے علاوہ طرح طرح کی خوبصورت لائٹس جلا رکھی تھیں اس کے باوجود ان دکانوں میں خال خال ہی گاہک تھے۔ البتہ ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکانوں میں لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔

کاریں پارک لائن میں آڑھی ترچھی قطاریں بنائے کھڑی تھیں کچھ ڈرائیور تازہ ہوا کھانے کے لیے اپنی اپنی کاروں کے باہر یوں کھڑے تھے جیسے وہ ڈرائیور نہ ہوں مالک ہوں۔ قریبی ہی کیمسٹ کی ایک دکان تھی جہاں اشرف کھڑا بوڑھے کیمسٹ سے مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا۔

"ارے اشرف تم یہاں۔؟"

ہاں یہ بہرام دارو والا میرا یار ہے۔ یہ دکان اسی کی ہے۔ آؤ باہر چل کر باتیں کریں۔ تمہیں یاد ہے نا۔ ہماری آخری ملاقات میٹرو میں ہوئی تھی۔ شاید یہی کوئی دو برس قبل۔" ہاں یاد ہے جُنید ــــ یہ بھی یاد ہے کہ میرے منع کرنے کے باوجود تم نے سارا بل

ادا کر دیا تھا ۔

" کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھتے ہو یار ۔ پہلے یہ بتاؤ کیا تم نے سارنگ پور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ۔

ایسا تو نہیں مگر بمبئی کی مہانگری میں ٹامک ٹوئیے ضرور مار رہا ہوں ۔

اشرف تم نے سارنگ پور چھوڑ کر بڑی غلطی کی ۔ ایک تو خاصی بھلی نوکری جاتی رہی ۔ دوسرے وہاں تمہیں قدم قدم تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا ۔

تکلیف کہاں نہیں ہے ۔ ہر جگہ ہے ۔

کم از کم تم اپنی والدہ کی خاطر بمبئی چھوڑ کر سارنگ پور آجاؤ تو زیادہ بہتر ہے ۔"

والدہ کی خاطر ۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ میرے جانے کے بعد ہی اچانک چل بسیں اب مجھے پرسہ نہ دو ۔ مجھے ہمدردی جتانے والوں سے ایک گھن سی آتی ہے ۔ تم میرے ایک اچھے دوست ہو یقین ہے تم میری اس بات کا برا نہیں مانو گے ۔ جنید تمہیں یاد ہے ۔ میرا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا ۔

آج کل وہ دوبئی میں ہے ۔ اس کمینے نے ہمیں یک لخت بھلا دیا ۔ میں نے اسے ماں کی علالت کی خبر دی تو پتہ ہے اس نے کیا کہا ۔

بیماری بوڑھوں کا مقدر ہے ۔"

پھر جب میں نے ماں کی موت کا اسے ٹیلی گرام بھیجا تو اس نے دو سطر ہی میں مجھے ٹرخا دیا ۔ موت برحق ہے ۔ ویسے میں نے یہاں فاتحہ خوانی کا انتظام کروا دیا ہے ۔ براہ کرم خط کو محبت کا پیمانہ نہ بنائیے ۔ میں یہاں ہمیشہ مصروف رہتا ہوں ۔"

اس کے بعد نہ میں نے اسے خط لکھا اور نہ اس نے ۔ اب میں نے اس کمینے کو بالکل ہی بھلا دیا ہے ۔ یہ ایک لمبی داستان ہے سن کر کیا کرو گے ۔ سوچ رہا ہوں ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لوں ۔ بھنڈی بازار میں ایک جگہ بھی دیکھ لی ہے ۔ ورنہ فٹ پاتھ تو ہے ہی ۔ اس ذلیل نے اگر چاہا ہوتا تو میں یہاں یوں دھکے نہ کھاتا ۔ خیر اللہ کا سہارا ہے ۔ کچھ نہ کچھ سبیل نکل ہی آئے گی ۔ اب سناؤ تمہارا کیا حال ہے کیا

اب بھی وہی امپورٹ اور ایکسپورٹ والا چکر۔"

"ہاں اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں۔"

"ہزار دو ہزار تو ماہانہ کسی طرح مل ہی جاتے ہوں گے۔"

"ہاں گزر ہو جاتی ہے۔ میں نے گول مٹول سا جواب دیا۔ حالانکہ میری ماہانہ آمدنی پانچ چھ ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

آؤ سامنے والا ہوٹل کچھ سونا سونا سا لگ رہا ہے۔ سکون اور گپ بازی کے لیے یہ جگہ مناسب ہے ہوٹل پہنچتے ہی بوڑھے بیرے نے اُسے اس طرح سلام کیا جیسے وہ بے تاج کا بادشاہ ہو۔ کافی یا چائے ۔۔ یا کچھ اور ۔۔۔ بیرے نے مودبانہ انداز میں کہا۔

دونوں مگر وقفہ وقفہ سے ۔۔ یہ میرا یار جنید ہے نا۔۔ ایک زمانہ بعد مجھے ملا ہے۔ اگر اس نے بل PAY کرنے کی کوشش کی تو تم ہرگز نہ لینا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"بھلا میں آپ کی بات ٹال سکتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد مجھے بوڑھا بیرہ ٹرے میں کافی کے دو پیالے ہاتھ میں تھامے قریب آتا دکھائی دیا۔ جنید دیکھا یہاں کی سروس۔ اگر کسی بڑھیا ریستوراں میں گئے ہوتے تو مینو دیکھتے ہی میں آدھا گھنٹہ بیت جاتا۔ اور آرڈر کی تکمیل تک کم و بیش دو گھنٹے۔ کبھی کبھی تو بڑھا یا بھی دستک دے جاتا ہے۔"

"بڑی عمدہ چائے ہے اشرف۔ تم نے اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا . .

"چلو چائے تو تمہیں پسند آگئی۔ اب جب کافی آئے تو اس کا بھی مزہ چکھ لینا۔"

نہیں یار مجھے کافی بالکل پسند نہیں۔ جب کبھی میں نے اسے حلق میں اتارنے کی کوشش کی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے سارے زمانے کی تلخیاں میرے گلے میں تیزاب بھر رہی ہوں۔"

"تو پھر آرڈر کینسل کروا دیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں ۔۔ میں اگر نہ پیوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی نہ پیو۔"

"نہیں آج تمہارا ساتھ دینے میں ہی میری عافیت ہے۔"

وہ تو ٹھیک ہے دو چائے اور منگوالیں گے اور کچھ بسکٹ بھی ۔"

بسکٹ میں کیا دھرا ہے۔ کوئی سادہ سا کھانا ہی منگالیں ۔ یا دو پلیٹ بریانی ۔ یہ ہوٹل بریانی کے لیے بھی اپنا ایک خاص معیار رکھتا ہے ۔ مگر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے سات بج چکے ہیں ۔ رات میں جلد کھانے سے نیند بھی اچھی آتی ہے ۔ میری اس لیکچر بازی سے کہیں تم بور تو نہیں ہو رہے ہو ۔

بور ہونے کی بھی خوب رہی ۔ تم جو چاہو یہاں سے منگوا سکتے ہو ۔"

پھر میز پر ایک ایک کر کے وقفے وقفے سے وہ سب چیزیں آگئیں ۔

اب وہ تیزی سے کھانے لگا ۔ جیسے اُسے کوئی اہم اپائنٹمنٹ یاد آگیا ہو ۔

میں نے اس سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا ۔ اور اس کے تتبع میں میرا بھی ہاتھ تیزی سے چلنے لگا ۔ جتنی اس نے یہاں کی بریانی کی تعریف کی تھی ۔ گو وہ ویسی نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ بُری بھی نہ تھی ۔ بیرے نے جوں ہی میز پر بل رکھا ۔ میں نے اچک کر اسے ہاتھ میں تھام لیا ۔ صرف چالیس روپے ۔؟

وہ نہیں تیس ہی روپے ہونا چاہیے ۔ شاید ان لوگوں نے کچھ دام بڑھا دیے ہوں ۔ مگر یہ بل تم کسی صورت بھی PAY نہیں کر سکتے ۔ کیوں بوڑھے بیرے کو میرے ہاتھوں مروانا چاہتے ہو ۔

میں نے دیکھا اب وہ اپنی جیبیں تلاش کر رہا تھا ۔

کہے دیتا ہوں یار ۔ ایسا کبھی نہ ہوگا ۔ تم یہ بل مجھے دے دو ۔"

لیکن میری مٹھی میں کاغذ کا وہ پرزہ بند تھا ۔ میں نے ٹپ (TIP) کی شکل میں پانچ کا ایک نوٹ بھی شامل کر دیا تھا ۔

آخر تم ہی نے یہ بازی جیت لی جنید ۔ یہ جرأت تمہارے علاوہ کسی اور نے کی ہوتی تو میں اس کا دماغ سیدھا کر دیا ہوتا ۔ اچھا اب اجازت دو ۔ ہو سکے تو ممبئی جانے سے پہلے ضرور ملوں گا ۔ یہ ملاقات کل بھی ہو سکتی ہے اور ہفتے بعد بھی ۔

وہ جب چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا ۔ لیکن میرے اس سکون میں بھی ایک

عجیب طرح کا اضطراب تھا۔ کیا وہ بل اسے دینا چاہیے تھا یا مجھے۔ بیرے نے یہ بل اس کے سامنے رکھنے کی بجائے میرے قریب کیوں رکھا۔ کیا بیرے کو اس نے پہلے ہی سے یہ ہدایت دے رکھی تھی۔ توبہ توبہ ۔۔۔ ان چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں نے آج مجھے کیوں اسیر کر رکھا ہے۔

بھلا چالیس روپے کا بل بھی کوئی بل ہے؟ جب کہ میں جیسے تیسے ماہانہ پانچ ہزار کما لیتا ہوں۔ ابھی تو وہاں اس کے پیر بھی نہیں جمے ہیں۔ ذہن کے افق پر اچانک ہونے والے ان سارے ٹیڑھے میڑھے خیالات کو روندتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔

اب میں اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ مگر رخصت ہونے سے پہلے جو اس نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا عجب کہ اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہو۔۔۔ نہیں نہیں وہ تو اس وقت شرمندگی کے بوجھ تلے دب سا گیا تھا۔

دو چار برس یونہی پر لگائے اڑ گئے تو میرے ذہن کی سلیٹ سے بھی اس کا نام تقریباً مٹ چکا۔ اور میں حسب معمول اپنے پھیلتے سکڑتے کاموں میں لگا رہا۔

پھر اچانک ایک دن سارنگ پور کی بڑی چھاؤنی کے راستے پر وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ یہ حادثہ بھی میری نادانی سے ہوا۔ اس کی حالت بڑی خستہ تھی۔ لگتا تھا جیسے ناگہانی آفتوں نے اس کی صحت کا کچومر نکال دیا ہو۔ وقتی طور پر ہمدردی کی ایک لہر دل میں جاگ اٹھی۔ لیکن ہمدردی کے اس جذبے کا میں نے فوراً ہی گلا گھونٹ دیا۔

کیا تم پھر سارنگ پور آ گئے۔۔؟"

تم تو یہی چاہتے تھے نا۔۔ اس کے لہجے میں بھی تلخی تھی۔

لیکن اس حال میں نہیں۔۔"

تو پھر کس حال میں۔۔"

یہ بھی کوئی پوچھنے یا بتانے کی کوئی بات ہے۔

تمہیں میری فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تم خواہ مخواہ مجھ سے ٹکرا گئے۔ بڑی چھاؤنی کے راستے میں ایک اندھا کنواں بھی پڑتا ہے۔ ذرا سنبھل کر جانا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اندھا کنواں ۔۔۔؟ یہاں تو میں نے آج تک کوئی اندھا کنواں نہیں دیکھا۔ تو پھر اس

نے مجھ سے اندھے کنویں کی بات کیوں کی۔ میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑا سا گیا۔ پھر راستہ چلتے چلتے میں نے قریب جاتے ہوئے راہرو سے پوچھا۔ بھئی یہاں کوئی اندھا کنواں بھی ہے۔؟

اندھا کنواں ــــ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔

نہیں نہیں کچھ نہیں ــ بس یونہی پوچھ لیا۔

کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خود ہماری زندگی ایک اندھا کنواں ہو۔؟

یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ آج لوگوں نے اپنی اپنی آنکھوں پہ پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔

میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ ممکن ہے سارنگ پور کے تاریخ کے اوراق میں اسی اندھے کنویں کا کہیں نہ کہیں کوئی ذکر ہو۔

اس طرح کئی برس بیت گئے۔ نہ مجھے اندھا کنواں ہی دکھائی دیا اور نہ اشرف۔

لیکن ایک دن دفعتاً میں نے ایک مقامی اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔

" دنیا کی پہلی اور آخری تجرباتی فلم " اندھا کنواں " جو کل سے بہ یک وقت دو تھیٹروں میں ریلیز ہو رہی ہے۔ رنگ محل اور داستان میں ــــ

اس اشتہار کو پڑھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اور میں آنے والے کل کا ابھی سے انتظار کرنے لگا۔ اور وہ کل بھی آ گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ شام سے پہلے ہی میں نے رنگ محل کا رخ کیا۔

فلم شروع ہونے میں ابھی چند ہی منٹ باقی تھے۔ لیکن دور دور تک کہیں بھی لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تھیٹر بھر چکا ہو۔ اور کوئی بھی سیٹ خالی نہ ہو۔ لیکن ہاؤز فل کا بورڈ تو لگا رہنا چاہیے۔ میں ایک لمحے کے لیے ڈگمگا سا گیا۔ دفعتاً میری نگاہ بکنگ ونڈو پہ گئی جہاں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑکی کے سوراخ سے یوں جھانک رہا تھا جیسے وہ کسی ذہنی عذاب میں مبتلا ہو۔

میں نے پانچ کا نوٹ تھماتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیا پکچر شروع ہو گئی۔؟

بس اب شروع ہونے کو ہے۔"

مگر ٹکٹ پہ سیٹ نمبر درج نہیں ہے۔"

کوئی بات نہیں ہے صاحب۔ آپ جہاں اور جس جگہ چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ پورا ہال ....
ابھی اس نے اپنا جملہ پورا کیا ہی نہ تھا کہ میں تیزی سے سینما ہال میں داخل ہو گیا۔ فلم ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا سینما ہال کی مدہم روشنی میں، میرے علاوہ صرف ایک آدمی تھا جس کی آنکھیں ایک عجیب و غریب سیاہ چشمے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یکبارگی مجھے لگا وہ اپنی شخصیت کے ہر بن مو کو مجھ سے چھپانا چاہتا ہو۔
پھر جب پکچر ختم ہوئی وہ آدمی سینما ہال سے نکل کر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ جیسے وہ اپنے ہی قدموں کی مدہم چاپ سے گھبرا رہا ہو۔ یا اسے اس بات کا ڈر ہو کہ کہیں کوئی اچانک اس سے ٹکرا نہ جائے۔
مجھے شبہ سا ہوا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں ۔ ؟ کچھ بھی تو یاد نہیں۔
دنیا کی پہلی اور آخری تجرباتی فلم جو ابھی میں نے دیکھی تھی اس کا تاثر ہولے ہولے میرے ذہن پر ضربیں لگا رہا تھا۔
مگر کیا۔ کچھ لوگ آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھے اس کی طرف کیوں بڑھ رہے ہیں۔
کہیں ایسا تو نہیں کہ اندھے کنویں کے سحر نے ان کے پاؤں میں پھر ایک بار بیڑیاں ڈال دی ہوں ۔۔ ؟